ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اکتوبر ۲۰۲۴ء

۱۵/روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ اسپورٹس گرل پریانشی کیسری کو چیک دیتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ خلانورد شبھانشو شکلا سے گفتگو کرتے ہوئے۔

جلد:79 شمارہ:06

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

اکتوبر ۲۰۲۴ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صباعرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اترپردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ		
اپنی بات		۲
مضامین		
خواجہ حیدر علی آتش کی شعری کائنات	ڈاکٹر احسان عالم	۳
انسانی قدروں کا شاعر: فراق گورکھپوری	حکیم رشاد الاسلام	۶
ڈاکٹر اختر بستوی: شخص اور شاعر	ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر	۹
اودھ کی گمنام شاعرہ بسم اللہ بیگم ناز	مفتی خبیر ندوی علیگ	۱۴
جدید لہجے کا منفرد شاعر: عرفان ستار	گلشن آرا	۱۷
منظومات		
غزل	احمد کمال حشمی	۱۹
غزل	محی بخش قادری	۲۰
غزلیں	عرفان نجمی / ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۲۱
غزلیں	حنیف نجمی / یاسین انصاری	۲۲
غزلیں	ڈاکٹر محمد شفیع سیتاپوری / نفیس وارثی	۲۳
غزل	صدام غنی	۲۵
غزل	مظہر میاں	۳۰
افسانے		
پیڑ کا رشتہ	ڈاکٹر عبدالغفار فاروقی	۲۴
سیلاب	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	۲۶
پناہ گاہ	سمینہ خان / شعیب نظام	۲۸
تبصرہ		
رات ڈھلنے کو ہے	مبصر: علی شاہد دلکش	۳۱
ترقیات		
اترپردیش کے کسان ہوئے خوشحال	غزالی ہشام	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سوسّی روپے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

اکتوبر ۲۰۲۴ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

گفتنی نا گفتنی

”ماہنامہ نیادور“ کی سابقہ تعطل شدہ شماروں کی تازہ اشاعت کا ایک اور مرحلہ طے ہونے کے لئے آمادہ ہے۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہوں کے کسی بھی ادبی رسائل وجرائد کی ادارت کی ذمہ داری بہت ہی حساس کام ہے۔ جس میں ذرا سی غیر شعوری فروگزاشتگی بھی ایک بڑے مسئلہ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس رسالے کی ادارت ہمیشہ سے ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس سے وابستہ مدیران کی ایک طویل فہرست ہے، ان میں سے کچھ ایسی شخصیات بھی ہیں جن کا نام اردو ادب میں آج بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے خون جگر سے اردو زبان وادب کی آبیاری کی اور اپنی اس بے لوث خدمت میں ہر طرح کے صلحتی رویہ سے گریز کیا، انھوں نے وہی کیا جو، ادب کے لئے موزوں اور سودمند تھا۔ انھیں مدیران کی ذہنی وفکری ثروت مندی کا نتیجہ ہے جو عالمی سطح پر اس رسالہ کو ایک امتیازی شناخت حاصل ہوئی۔ ورنہ کسی بھی رسالے کو اتنی پذیرائی حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کی اس رسالے کے ادارت کی ذمہ داری انتہائی چیلنجگ ضروری ہے لیکن مشکل نہیں۔

چونکہ میں اس بات کو لے کر کافی پُر اعتماد ہوں کہ ”ماہنامہ نیادور“ سے وابستہ دانشوروں، تخلیق کاروں، قلمکاروں اور اردو زبان وادب سے محبت کرنے والوں خاص طور سے وہ افراد سے جن کا بنیادی مطمع نظر زبان وادب کی خدمت ہے۔ وہ اس کام میں میری مدد ضرور کریں گے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی عرض کرنا مناسب سمجھتی ہوں، کہ یہ بات آپ مجھ سے بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں جب فکری مباحث اور تنقیدی مطالعے کے لیے سنجیدہ پلیٹ فارمز کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں ”ماہنامہ نیادور“ س روایت کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ لہٰذا اجتماعی طور پر ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کی اس رسالے کی اشاعت کا سلسلہ ہر ممکن صورت میں جاری وساری رہے۔ تاکہ اس کے ادبی فیض سے ایک زمانہ سیراب ہوتا رہا ہے۔

”ماہنامہ نیادور“ ایک سرکاری رسالہ ہے، اس کی پالیسی دیگر رسائل سے قدر مختلف ہے لہٰذا اس کے مدیر کے بھی متعین دائرۂ اختیار ہوتے ہیں جس کے اندر ہی رہ کر ساری ذمہ داریاں سرانجام دینی ہوتی ہیں۔ جس کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھتی بلکہ اپنے قارئین کے صواب دید پر چھوڑتی ہوں۔ میرے کہنے مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ”ماہنامہ نیادور“ کا مستقبل اس کے شاندار ماضی کی طرح ہی درخشندہ اور تابندہ رہے، تو اس کے لئے آپ کو اتنی زحمت ضرور کرنی ہے کہ ”ماہنامہ نیادور“ سے زیادہ زیادہ لوگوں کے جوڑیں۔ اسے ایک تحریکی شکل دیں، یہ کام اتنا دشوار گزار بھی نہیں بس آپ کو یہ کرنا ہے، اس رسالے سے جڑا ہوا ہر فرد کم ازکم پانچ لوگوں کو اس رسالے کی ممبر شپ ضرور دلائے، (زرسالانہ 180 روپیہ) تاکہ حکومت اس بات سے مطمئن رہے کہ اُس کی سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ ادبی رسالہ لوگوں کی دلچسپی کی بنیاد پر ہی شائع ہو رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ گزشتہ شمارہ کی طرح یہ شمارہ بھی قارئین کے لیے نہ صرف دلچسپی کا باعث بنے گا بلکہ ان میں مزید غور وفکر اور تنقیدی مطالعے کا شوق بھی پیدا کرے گا۔ ہم اپنے تمام اہل قلم کے شکر گزار ہیں۔ ہمیشہ کی طرح، آپ کے مشوروں اور آراء کا استقبال ہے تاکہ ”نیادور“ اپنے مقصد کی تکمیل میں مزید بہتر ہو سکے۔ شکریہ

آسیہ خاتون

یہ شمارہ اکتوبر ۲۰۲۴ء کا ہے جس کو نومبر ۲۰۲۵ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر احسان عالم

پرنسپل الحراء پبلک اسکول، در بھنگہ

9431414808

خواجہ حیدر علی آتش کی شعری کائنات

یہ تاریخی سچائی ہے کہ دلی کو ہی ادباء شعرا کی توجہ کا مرکز سمجھا جاتا رہا لیکن جب یہ مرکزیت لکھنو کی طرف منتقل ہوئی تو اس کے ابتدائی دور میں جن شعرا نے اس دور کی تہذیب وثقافت کو تخلیقی سطح پر شاعری کا حصہ بنا کر لکھنو کے انداز فکر کو اردو شاعری کی ایک نئی روایت کی صورت دی ، ان میں خواجہ حیدر علی آتش کا نام سر فہرست ہے ۔خواجہ حیدر علی آتش ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے ۔ان کے والد خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔جو جنگ بکسر کے موقعہ پر دلی کی تباہ کاری کو دیکھتے ہوئے فیض آباد چلے آئے ۔آپ کا خاندان چونکہ بغداد سے دلی آیا تھا اسلئے آپ کا سلسلہ نسب سلسلہ نقشبندیہ کے ممتاز بزرگ خواجہ عبداللہ حرار سے ملتا ہے ۔

ابھی وہ جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے رحلت کے ساتھ ہی آپ کا تعلیمی سفر بھی تھم گیا۔اس کے بعد انہوں نے فوج کے آوارہ لڑکوں کی صحبت اختیار کرلی جن کی وجہ سے ان کی زندگی پر بھی آوارگی کی چھاپ پڑنے لگی، زندگی کا ایک لمبا قیمتی وقت اس حالت میں گذرا۔اخیر میں انہوں نے نواب مرزا تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کرلی ۔کچھ دنوں ان کے پاس رہنے کے بعد انہیں کے ساتھ فیض آباد سے لکھنو آ گئے ۔جس وقت آپ لکھنو پہونچے اس وقت وہاں مصحفیؔ اور انشاء کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے ۔اس ماحول نے ان کے ذہن وفکر میں بھی شاعری کا رنگ بھر دیا۔پھر مصحفی کی شاگردی نے ان کو فن شاعری کا ایسا امام بنادیا کہ نہ معلوم کتنے شعراء ان کے نقش قدم پر چل کر اپنی شاعری کو کامیابی کے دہلیز پر پہونچایا۔آتش کی تعلیم کا سفر اگرچہ بچپن میں تھم گیا تھا لیکن اس وقت تک انہوں نے فارسی زبان پر جو عبور حاصل کرلیا تھا اس نے ان کی شاعری میں معنویت کا رنگ بھرنے میں اہم کردار ادا کیا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے فارسی میں اپنی شاعری کی شروعات کی ۔لیکن جب آپ کا میلان اردو کی طرف بڑھا تو آپ نے فارسی کو اس طرح ترک کر دیا کہ گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔فطری اعتبار سے آتش نہایت غیور اور خود دار واقع ہوئے تھے ۔مزاج میں سادگی تھی، خودداری کا عالم یہ تھا کہ اپنی زندگی میں ہمیشہ معاشی تنگی کا شکار رہے ۔مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔امرا کے قدرداں ضرور تھے مگر کبھی بھی انہوں نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنی غیرت کو امتحان میں نہیں ڈالا۔اردو ادب کے مشہور مورخ رام بابو سکسینہ نے آتش کی ان سب خوبیوں پر بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے لکھتے ہیں :

> ”وہ حسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج ،شاہانہ وضع اور لباس رکھتے تھے، مگر اس میں بھی بانکپن کو دخل تھا، تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے، قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی ، کبھی کسی امیر کی اس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی ، شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے، مگر ان کا دستِ سوال کسی کے سامنے دراز نہ ہوا۔اسی روپیہ مہینہ بادشاہ کی طرف سے ملتا تھا جس سے بہ مشکل گذارا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔محلہ محال خاں کے سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے، مزاج میں انتہا درجہ کی وضعداری اور خود داری تھی ۔امرا سے بہت نوک کی لیتے تھے مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوتے تھے ۔“

(تاریخ ادب اردو ص: ۱۵، رام بابو سکسینہ، ناشر: ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی)

> ”آتش کے کلام میں جہاں دوسرے عنوانات موتی کی طرح بکھرے دکھائی پڑتے ہیں وہیں اس میں صوفیانہ و مابعد الطبیعاتی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوئی ہیں اور یہی نہیں بلکہ آتش نے اپنے شاعرانہ کلام میں غربت، وطن، ہستی، پردہ، دیر وحرم، جسم خاکی، دیدار، روح، اسم اعظم، نفس، جبر و اختیار، باطن و ظاہر، مجاز و حقیقت ، بے ثباتی ، ترک رسوم، باز ار دہر، بے معرفت اور مکان ولامکاں جیسے اصطلاحات کو بھی نمایاں طور پر جگہ دی ہے ۔ان سب کے علاوہ آتش کے کلام میں وہ رمز بھی ملتا ہے جن کا در تصوف کے مکان میں ہی کھلتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ تصوف فکر آتش کا وہ بنیادی جز ہے جس نے ان کی شاعری اور ان کے کلام پر گہرا اثر ڈالا۔آتشؔ کے کلام کی صوفیانہ رنگت پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔“

یوں تو آتش صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔مگر جس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں وہاں رنگ اور نور برس رہا تھا۔لکھنؤ کی رنگا رنگی اور رقص وسرود میں دہلی کی سادگی دفن ہوگئی تھی اور تصوف کی جگہ تعیش نے لے لی تھی۔نوابوں کی دولت پانی کی طرح بہتی ہوئی دکھائی پڑتی تھی۔قصیدے پر قصیدے لکھے جا رہے تھے۔مبتذل اور فرسودہ مضامین اشعار کا حصہ بننے لگے تھے۔معشوق کی سراپا نگاری ، زیورات اور لباس، حرکات وسکنات متانت وحیا کے بجائے شاعروں کی نگاہ شوخی و بے حیائی پر چمکنے لگی تھی۔غرض یہ کہ اس ماحول میں کسی کا رنگ یکساں دکھائی پڑتا تھا۔ظاہر ہے کہ اس صورت حال نے آتش پر گہرا اثر ڈالا ، نتیجتاً ان کی شاعری بھی اس رو میں بہہ گئی۔نمونہ کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کریں:۔

چھلّے جڑاؤ پہنے ہوئے پور پور میں
دکھلا رہے ہیں ہم جڑ اور نگار ہاتھ
ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شب برات
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

(موج ادب ص:۱۲۸)

آتش کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگتا ہے کہ ان کے کلام میں اداسی، پسپائی اور شکست خوردگی کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، بلکہ رجائیت، بلند حوصلگی اور جواں مردی کو ہی انہوں نے اپنے لئے آئینہ اور نمونہ بنایا تھا۔سنبل نگار لکھتی ہیں:

"وہ ناموافق حالات سے خوف زدہ نہیں ہوتے، ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں، ان کا سبب لکھنؤ کا پر آسائش ماحول ہی نہیں، بلکہ خود آتش کا قلندرانہ مزاج بھی ہے۔"

(اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ص:۵۱ سنبل نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

غرض یہ کہ آتش کسی بھی طرح حالات کے سامنے سر جھکانے کے عادی نہیں تھے۔بلکہ وہ ناامیدی میں بھی امید کی راہ نکال لینے کے عادی تھے۔بلکہ یہ کہا جائے کہ زندگی کے سلسلہ میں پر امید رویہ ان کی شاعری کا وصف خاص بن گیا۔ملاحظہ ہو ان کی غزل کے چند اشعار:

ہوا سے دردِ لے خوش گوار رہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے
سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

ایک اور مشہور غزل کا شعر ہے:

بحرِ الفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے
ناخدا جو نہیں رکھتے وہ خدا رکھتے ہیں

آتش نے چونکہ دہلی اور لکھنؤ کے حالات و ماحول کو بڑے قریب سے دیکھا تھا اس لئے ان کی شاعری میں مزاج اور اظہار کا ایک ایسا الگ پن دکھائی پڑتا ہے جو کسی بھی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتا۔ان کے اشعار میں ندرت ادا بھی ہے اور تازگی نظر بھی اور اس کے ساتھ ان کی شاعری میں ایک ایسا نیا پن محسوس ہوتا ہے جسے ہم ان کی پہچان کہہ سکتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد اشعار ضرب المثل بن کر آج بھی ہماری روزمرہ بول چال کی زبان کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔اس کے لئے دیکھئے یہ اشعار:

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جاہ ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

من تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے جان پر
دل سے دشمنی کی عداوت کا گلا جاتا رہا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خوں نہ نکلا

لگے منہ چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی بھی خبر لیجئے دہن بگڑا

(تاریخ ادب، اردو، جلد ۳ ص:۷۲۸، ڈاکٹر جمیل جالبی)

آتش کی ان شاعرانہ خوبیوں پر اردو ادب کے مشہور مورخ رام بابو سکسینہ نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا ذکر کچھ کم دلچسپ نہ ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

"کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔تصنع اور تکلف مطلق نہیں، نہ معمولی اور متبذل خیالات ہیں، جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو، بے جال، فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ، اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں انعکاس اور میر کی طرح درد واثر کی تڑپ نہیں ہے، پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔میر وغالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔فوق البھڑک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں، زبان بہت مزے دار اور روزمرہ کی بول چال ہے جس میں ابتذال نہیں ہے، شعر بآسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔"

(تاریخ ادب اردو ص:۱۵۲، رام بابو سکسینہ، ناشر ادارہ کتاب الشفاء)

آتش کے کلام میں جہاں دوسرے عنوانات موتی کی طرح بکھرے دکھائی پڑتے ہیں وہیں اس میں صوفیانہ و مابعد الطبیعاتی اصطلاحات کثرت سے استعمال ہوئی ہیں اور یہی نہیں بلکہ آتش نے اپنے شاعرانہ کلام میں غربت، وطن، ہستی، پردہ، دیر وحرم، جسم خاکی، دیدار، روح، اسم اعظم، نفس، جبر و اختیار، باطن وظاہر، مجاز و حقیقت، بے ثباتی، ترک رسوم، باز ادہر، بے معرفت اور مکان ولامکاں جیسے اصطلاحات کو بھی نمایاں طور پر جگہ دی

ہے ۔ان سب کے علاوہ آتش کے کلام میں وہ رمز بھی ملتا ہے جن کا در تصوف کے مکان میں ہی کھلتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ تصوف فکر آتش کا وہ بنیادی جز ہے جس نے ان کی شاعری اور ان کے کلام پر گہرا اثر ڈالا۔آتش کے کلام کی صوفیانہ رنگت پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"آتش نے اپنی شاعری میں تصوف کا چراغ روشن کر کے اپنی تخلیقی توانائی سے باطنی واردات کے چراغ جلائے اور اردو شاعری کو ایک ایسا رخ دیا جو درِ ناسخ کے لئے وقت کی راگنی نہیں تھا۔آتش کے کلام میں جو توانائی اور عارفانہ وجدان نظر آتا ہے۔اس کا مخرج و منبع تصوف ہے۔ اس دور میں آتش کی شاعری وہ چراغ ہے جس نے اس دور کے باطن کو روشن کیا اور اس کی خارجیت میں داخلیت کا عنصر شامل کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھا، اگر اس دور سے آتش کی شاعری کو خارج کر دیا جائے ،تو آج اس دور کی اہمیت صرف باقی نہیں رہتی بلکہ معلوم ہوگا کہ بنجر زمین میں ایک ہی طرح سے بار بار ہل چلایا جا رہا ہے۔"

(تاریخ ادب اردو، جلد:۳،ص:۷۳۴،ڈاکٹر جمیل جالبی)

آتش کے تصوف کی وسعت و نوعیت کا اندازہ ان کے ان اشعار سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

"ہستی مانی سے قصد روح ہے سوئے عدم
دل کو خوش وقتی ہے غربت سے وطن جاتا ہوں میں
اس شش جہت میں خوب تیری جستجو کریں
کعبے میں چل کے سجدہ تجھے چار سو کریں
دیدار عام کیجئے پردہ اٹھائیے
تاچند بندہ ہائے خدا آرزو کریں"

(تاریخ ادب اردو ص:۷۳۴،ڈاکٹر جمیل جالبی،ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی)

آتش غزل کے شاعر تھے، یہی وجہ ہے کہ دیگر شعراء کی طرح انہوں نے بھی عشق کے بیشتر پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔اس سلسلے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"آتش کے یہاں عشق انسانی زندگی کے ایک خلاق جذبہ کا نام ہے۔ اس لئے وصل کا بیان بدن کی خوشبو کے ساتھ دماغ کو معطر کر دیتا ہے اور پڑھنے یا سننے والے کو کیف و سرمستی کے عالم میں لے جاتا ہے۔بدن ایک حسین چیز بن کر احساس جمال کو لاکھڑا کرتا ہے۔آتش کے یہاں عشق ذوق وشوق کی طرح توانائی کی علامت ہے اور ساری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔"

(تاریخ ادب اردو ص:۷۲۹،ڈاکٹر جمیل جالبی،ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی)

مجموعی طور پر بس یہ کہا جائے کہ آتش کے یہاں جسم و روح ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور جذبہ عشق کے اظہار کو پاکیزہ بنا دیتے ہیں، ان کا عشق خیالی نہیں بلکہ ایسا فطری معلوم ہوتا ہے جس میں ہجر بھی وصال بھی۔ہجر میں وصال کی کیفیت اس لئے ہے کہ ان کے یہاں ہجر وصال کے وقفے کا نام ہے۔یہی وجہ ہے کہ آتش کے لہجہ میں جگہ جگہ سرمستی سرشاری اور رقص کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔اس حقیقت کی ترجمانی ان اشعار سے ہوتی ہے:

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا
کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے اپنا
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائگاں کاٹے
خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری
ٹھہرے نہ پھر جو راہ میں تیری نکل چلے
شل ہوگئے جو پاؤں تو ہم سر کے بل چلے

(تاریخ ادب اردو،ص:۷۲۹،ڈاکٹر جمیل جالبی،ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی)

آتش کے مجموعہ کلام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے وہی شاعری کو کسی کے نقش قدم پر نہیں چلایا بلکہ ایک حساس اور ذمہ دار فرد کی طرح انہوں نے اپنے گردوپیش کا مشاہدہ کیا اور پھر جو تجربات ان کے سامنے آئے انہیں اشعار کے روپ میں ڈھال دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اشعار زندگی کے قیمتی تجربات سے معمور نظر آتے ہیں۔اس سلسلہ کے چند اشعار ذکر کیا جاتا ہے:

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کر آگ مجھے کارواں روانہ ہوا
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیال یار
شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریئے

(اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ،ص:۵۶،ڈاکٹر جمیل سنبل نگار،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ)

آتش کے کلام میں اخلاقی موضوعات کی آمیزش بھی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ان موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر نہ صرف انہوں نے انسان کی قوت عمل کو ابھارا ہے بلکہ انہوں نے اپنے چاہنے والوں کو بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا بھی درس دیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو
دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا
خواب غفلت میں نہ کھو ہنگام میری رائگاں
چونک ہوتی ہے نماز صبح اے غافل قضا
لذت کو ترک کر تو ہو دنیا کا رنج دور
پرہیز بھی دوا ہے جو بیمار نے کیا
نہ تو بھوکے ہوئے تھے ہم نہ تو پیاسے پیدا
ہوگئے روگ یہ دنیا کی ہوا سے پیدا

(تاریخ ادب اردو،ص:۷۳۴،ڈاکٹر جمیل جالبی،ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی)

آتش نے دو دیوان مرتب کئے ایک تو ان کی زندگی میں شائع ہوگیا جب کہ دوسرے دیوان کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ممکن ہوئی۔آتش چونکہ ایک الگ مزاج کے شاعر تھے اور ان کی فکر پر لکھنوی انداز غالب تھا اس لئے انہیں اپنی زندگی میں بہت سے شعراء کی تربیت کا موقع ملا اور نتیجتاً آپ نے جو شاگرد چھوڑے ان میں رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب، مرزا شوق اور آغا ہجو جیسے نامور شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔

زندگی کے ساتھ چونکہ موت لگی ہوئی ہے۔اس لئے شاعری کی دنیا پر ایک لمبے عرصے تک راج کرنے کے بعد لکھنؤ کے اندر شاعری کو ایک منفرد پہچان دینے والا شاعر خواجہ حیدر علی آتش ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۷ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

□□□

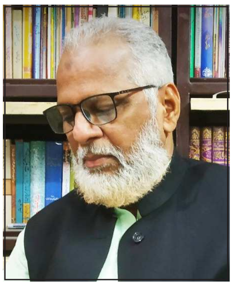

حکیم رشاد الاسلام
شافی دواخانہ، سبزی منڈی چوک، الہ آباد
9559669955

انسانی قدروں کا شاعر: فراقؔ گورکھپوری

فراقؔ گورکھپوری کی پیدائش 28 اگست 1896 کو شہر گورکھپور اتر پردیش میں ہوئی ۔دہلی میں ان کاانتقال 3 مارچ 1983 میں ہوا۔فراقؔ گورکھپوری کااصل نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراقؔ گورکھپوری تھا۔فراقؔ صاحب نے بچپن سے والدین کے ذریعے تلسی داس کی رامائن کاپاٹھ سنا تھا اسی لیے ان کے مزاج میں شائستگی سرائیت کرگئی تھی ،جس کا وہ زندگی بھر نمونہ بنے رہے ۔اور یہی وہ اصل وجہ تھی کہ خدمت خلق آپ کا وطیرہ بنی ہوئی تھی ،انسان کی عظمت وانسانیت کی تبلیغ کرتے رہے ۔ان کی موت کے بعد فراقؔ کو ملک کے اندر اور ملک سے باہر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے ۔ان کے بارے میں لوگوں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں لیکن یہاں یہ ذکر مقصود ہے کہ اس عظیم شاعر نے جو اپنے خاندان والوں سے دور صرف اپنے ملازمین کے ساتھ رہا ہو ان خدمت گاروں پر کیا اثرات چھوڑے ،اس کا پتہ لگانے کے لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ فراقؔ صاحب کے ملازموں سے ملا جائے ،چنانچہ میں ان کے بنگلہ واقع بینک روڈ گیا اس وقت ان کے بنگلہ پر بالکل سناٹا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہاں کبھی کوئی رہا ہی نہ ہو،لان پر دو ایک کرسیاں پڑی تھیں ،جن پر کچھ اخبار والے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے ۔

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموشی
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

سب سے پہلے میری ملاقات فراقؔ صاحب کے سکریٹری رمیش دویدی سے ہوئی ،رمیش فراقؔ کے ساتھ قریب 30 سال سے تھے ،انہوں نے مجھے بتایا فراقؔ صاحب نے ہم لوگوں کے ساتھ ایک اچھے مالک کا برتاؤ کیا ،وہ ایک اچھے رحم دل انسان تھے ،وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر ہی کیا کرتے تھے ۔وہ ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے ،اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیے کہ جب 1973ء میں وہ روس جانے والے تھے تو انہوں نے سرکار سے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے ملازم بھی جائیں گے ،لیکن بعد میں وہ روس نہیں گئے اور پروگرام ختم ہوگیا۔

رمیش نے آگے کہا ’’فراقؔ صاحب زندہ نہیں ہیں لیکن اب صرف ان کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں میں فراقؔ صاحب کے ساتھ آخری وقت تک رہا ان کے چہرے پر وہی شاعرانہ انداز آنکھوں میں وہی چمک تھی ،ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ دہلی سے الہٰ آباد لے چلو‘‘ رمیش نے بتایا فراقؔ صاحب نے جوشؔ کی خبر سُن کر ڈاکٹر سے کہا ’’کیا ڈاکٹر صاحب آپ میرے دل میں جو درد اٹھا ہے اسے ٹھیک کر سکتے ہیں ‘‘ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے ملازموں کو کسی کام پر لگا دیا جائے ،یہ ملازم اِدھر اُدھر نوکری کے لیے نہ بھٹکیں ۔رمیش جی سے میں نے پوچھا فراقؔ صاحب کا سب سے اچھا شعر جو آپ کو پسند ہو سنائیے انہوں نے یہ سنایا

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک مِحبت کا بھروسا بھی نہیں

رمیش نے روتے ہوئے کہا لیکن موت کے ناپاک ہاتھوں نے فراقؔ صاحب کو معاف نہیں کیا خدا کے سامنے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے‘‘ ۔رمیش کے بعد میں فراقؔ صاحب کے ایک بہت خاص ملازم پنّا سے ملا جو فراقؔ صاحب کے ساتھ 35 برسوں سے تھا وہ فراقؔ صاحب کو کھانا کھلاتا ،پاخانہ پیشاب کراتا ،سگریٹ جلا کر دیتا غرض کہ ہر کام کرتا تھا ۔پنّا نے بتایا بابو جی ہم کو بہت مانتے تھے ،

’’فراقؔ کی غزل جذبہ کو ذہن اور ذہن کو احساس میں تبدیل کرنے کا ایک انوکھا تجربہ ہے ،اسی تجربہ نے ان کی غزل کو ایک ایسے آفاقی مزاج سے روشناس کیا ہے جو غالبؔ و میرؔ کے بعد اردو غزل کی تیسری غزل کہی جاسکتی ہے ۔اور جو ہم سے ہمارے عہد سے زیادہ قریب اور مانوس ہے ۔فراقؔ نے صرف غزل کہہ کر ہی اردو شاعری پر احسان نہیں کیا بلکہ صنف غزل کی مجموعی فضا کی نئی تعمیر میں جو ان کا رول رہا ہے وہ بھی کم اہم نہیں ہے ۔نئی غزل کو بنانے سنوارنے میں یگانہؔ کے ساتھ فراقؔ کا نام بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔

فراقؔ صاحب کے فن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس فضا کو نئی جمالیات کے رنگ و بو کے ساتھ غزل کا مزاج کا جزو بنا دیا ہے ۔ان کی اپنی آواز ہے ۔ان کا اپنا الگ اسلوب ہے اور اپنا الگ لہجہ ہے جس کی وجہ سے وہ اردو میں جانے وپہچانے شاعر ہیں ۔‘‘

ان کے چلے جانے کے بعد اب ہم کو یہاں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پنّا نے کہا بابو جی کبھی بہت غصہ ہوتے تو کبھی بہت خوش ہوتے، خوش اس دن مجھ سے بہت زیادہ ہوئے تھے جب دہلی میں اسپتال میں اندرا گاندھی فراقؔ صاحب سے ملنے آئیں، فراقؔ صاحب نے مجھ سے پوچھا کون آیا ہے میں نے کہا ''اندو'' (اندرا گاندھی) کا گھر کا نام پہلے تھا آئی ہیں۔ فراقؔ صاحب نے کہا تم کو ابھی تک یہ نام یاد ہے میں تو بھول گیا تھا۔ پنّا نے مزید بتایا کہ فراقؔ صاحب سے اور مجھ سے مقدمہ بھی چلا، واقعہ یہ ہوا تھا کہ فراقؔ صاحب کے گھر سے ان کے بہت سے میٹل اور کچھ سامان چوری ہو گیا انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ چوری میں میرا نام بھی لکھوا دیا لیکن بعد میں ان کو پتہ چلا کہ میں بے قصور تھا تو فراقؔ صاحب نے کورٹ جا کر مقدمہ واپس لے لیا، ایسے اچھے آدمی تھے فراقؔ صاحب۔ پنّا نے فراقؔ صاحب کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے اور بہت کچھ بتایا مثلاً پنّا کی زبانی فراقؔ صاحب ہم لوگوں کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جب میں پہلے پہلے کام کرنے فراقؔ صاحب کے گھر آیا تو میں بہت بور ہوتا تھا، کیونکہ میں جاہل ان پڑھ اور یہاں پڑھے لکھے لوگ تھے، میری بوریت کو بھانپ کر فراقؔ صاحب ایک ریڈیو خرید کر لائے اور مجھ کو دیا اور کہا پنّا اس کو سنا کرو۔ فراقؔ صاحب کے یہاں کوئی ضرورت مند آتا تو وہ خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ پنّا نے یہ بھی بتایا فراقؔ صاحب مذاق بھی بہت کرتے تھے، ایک بار ایک محفل میں کسی نے فراقؔ صاحب سے کہا کھڑے ہو کر شعر سنایئے فراقؔ صاحب بولے میرے پائجامہ کا آزار بند کھلا ہے۔ (فراقؔ صاحب اِدھر دس (10) سال سے بیٹھ کر ہی پڑھتے تھے) پنّا نے کہا یہ ہمارا سو بھاگیہ ہے کہ ہم اتنے بڑے شاعر کے یہاں تھے، ان کا ایک شعر ہم کو بہت پسند ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

کسی کو کون ہوا عمر بھر مگر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکہ ہے مگر پھر بھی

پنّا کے بعد میں فراقؔ صاحب کے بستر کے خدمت گار طوفانی سے ملا، جو فراقؔ صاحب کے گھر کا سارا کام کرتا تھا، بازار سے سامان لانا، گھر کو صاف رکھنا وغیرہ طوفانی نے روتے ہوئے کہا فراقؔ صاحب ایسا مالک ہم کو نہ ملے گا، وہ لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب وہ کھانا کھاتے تو ہم لوگوں سے برابر پوچھتے کھانا کھایا کہ نہیں ہم نے بابو جی سے بہت کچھ سیکھا بھگوان بابو جی کو جنت دے بابو جی نے جو احسان ہم لوگوں پر کیے ہیں بھگوان اس کا پھل ان کو ضرور دے گا۔ بات چیت کے دوران طوفانی روتا رہا میں نے اس سے پوچھا فراقؔ صاحب کا کوئی شعر تم کو یاد ہے وہ بولا ہم جاہل ضرور ہیں لیکن ایک شعر کا مطلب خوب سمجھ گئے تھے۔ فراقؔ صاحب اپنی زندگی میں ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں شعر وہ والا ہے۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
جب بھی ان کو دھیان آئے گا تم نے فراقؔ کو دیکھا ہے

پنّا کے بعد میں فراقؔ صاحب کے آخری اور چوتھے خدمت گار جو ایک عورت تھی، مایا سے ملا، مایا دراصل ایک فقیر تھی جو کسی طرح مانگتے مانگتے فراقؔ صاحب کے گھر آئی اور فراقؔ صاحب نے اسے اپنے یہاں نوکر بنا کے رکھ لیا۔ مایا روتی ہوئی کہنے لگی ہمارا اب کا (کیا) ہوئی (ہوگا) بابو تو چلے گئے اب ہم کو کون کھانا دے گا۔ فراقؔ صاحب اسے بہت مانتے تھے، میں ان سب سے ملنے کے بعد بنگلہ کے باہر بینک روڈ پر چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا ایک شاعر بھی کیا ایک اچھا مالک ہو سکتا ہے، اپنے نوکروں کے دل پر اپنے نقش چھوڑ سکتا ہے، ان سوالوں کا جواب مجھے مل چکا تھا، اور مجھے اردو کے اس بلند فکر انسان اور انسانیت کے اعلیٰ مُدارج پر فائز بے باک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں

فراقؔ صاحب کے انتقال پر اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جس طریقے سے اپنی ہمدردی کا والہانہ اظہار کیا تھا وہ بھی ایک نظیر ہے اردو ادب کے لیے۔ عظیم ترین شاعر فراقؔ صاحب کے تعلق سے بیان:

''فراقؔ گورکھپوری کی وفات سے چند روز قبل جوشؔ رخصت ہوئے آج فراقؔ کی باری آ گئی۔ ادب کی دو قد آور شخصیتیں اٹھ گئیں۔ اردو اور ہندوستان کو دو کاری ضربیں لگیں، موت ہمیشہ غمناک ہوتی ہے اور ایک شاعر کی وفات تو خاص طور پر تکلیف دہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ پیامِ حسن دیتا ہے اور ہمارے شعور میں احساس پیدا کرتا ہے، اس کے ساتھ یہ اس بات کو یاد کرنے کا موقع ہے کہ شاعر نے ہم سب کو کسی طور پُر ملال کیا۔ فراقؔ کو شگفتگیٔ فن کا عطیہ حاصل تھا، انہوں نے انسان کے لاتعداد پہلوؤں مثلاً لطافت و قہقہہ و برہمی اور اخلاص کی کھوج کی اور ہمارے عوام کے تہہ در تہہ شعور کو متاثر کیا، میرے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ میں ان کو برسوں سے جانتی تھی، وہ وقتاً فوقتاً مجھے خط لکھتے تھے، جس طرح میرے والد لکھا کرتے تھے۔''

غور کیجیے ملکی وزیر اعظم اپنے تعلق کی بات نہیں کر رہی ہیں ایک عظیم والمرتبت اور بلند و بالا ایسے شاعر کے بارے میں بات کر رہی ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام کا شعور بیدار کیا۔ انہیں اخلاص و ہمدردی کے معنی و مطالب بتائے، سچ پوچھیں تو یوں ہی فراقؔ کا شعر اوادبا میں افتراق نہیں تسلیم کیا گیا بلکہ ان کی انسانیت و اخلاقی قدروں کی فکر نے انہیں فراقؔ صاحب بنایا، اور اپنے خادم کے سامنے ایک مرتبہ وہ اندرا گاندھی کو 'اندو' کہتے ہیں اور اس میں ان کے خلوص کا بڑا دخل ہے۔ میں سمجھتا ہوں فراقؔ صاحب کے انتقال کے بعد جس طرح کے مضامین ان کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے یا ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا وہ فراقؔ صاحب کے چاہنے والوں کے لیے یقینی فخر کی بات ہے۔ انگریزی اخبار کی خصوصی پیشکش (سنڈے میگزین) میں شائع ایک انٹرویو کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ آپ اس میں شامل ہوں۔ سندھیا سنگھل نے اپنے انٹرویو میں فراقؔ صاحب کو (دا لیجنڈ اینڈ دا مین) سرخی میں لکھا۔

فراقؔ صاحب بین الاقوامی سطح پر اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تیار عقل سنکی طرز عمل، اور حقارت یا قائم کردہ اصولوں نے ان کی پہلے سے ہی پُر اسرار شخصیت کو بدنامی کی ایسی چمک عطا کی ہے جو رنگا رنگ فراقؔ لیجنڈ کا حصہ اور پارسل بن گئی ہے۔ ان کی بول چال نے جب کہ کچھ کو ناراض بھی کیا، اسے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے جنھوں نے ان کی ذہانت کی جھلک دیکھی تھی۔ سندھیا سنگھل نے ایک زندہ لیجنڈ فراقؔ گورکھپوری کا انٹرویو کیا جو 84 سال کی عمر میں اپنی الٰہ آباد رہائش گاہ پر عملی طور پر بستر پر پڑے ایک لوس کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس انٹرویو میں سندھیا سنگھل نے غیر معمولی باتیں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ سب فراقؔ صاحب سے دریافت کیا جس سے عام قاری محروم تھے کسی کا سنکی طرز عمل، قائم کردہ اصولوں پر زور دیا جانا ضرور ان نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی بنیاد شخصیت اور اس کے فن پر مبنی ہے۔ فراقؔ صاحب سندھیا سنگھل کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہتے ہیں، اسے سندھیا سنگھل نے من و عن نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں فراقؔ کی ایک رنجش یہ ہے کہ لوگ ان سے ان کی زندگی، اس کی مقبولیت اور ان سے جڑی بے

شمار افواہوں کے بارے میں پوچھتے ہیں،لیکن وہ ان سے ان کی شاعری کے بارے میں کبھی نہیں پوچھتے،جس کی وجہ سے وہ مقبول ہوئے اور ان کے بارے میں بہت چرچا ہوئے۔

فراقؔ صاحب نے اپنی سگریٹ نوشی پر بھی اظہار خیال خود ہی کیا ہے،سندھیا سنگھل نے فراقؔ صاحب کی زبان سے ادا ہوا جملہ من وعن اس انٹرویو میں شامل کیا تھا’’ میں ابھی سگریٹ پی رہا ہوں،اور یہ میرے لیے جیل جانے سے کہیں زیادہ اہم ہے‘‘ فراقؔ۔آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے خاص معاملات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کس قدر سچے اور حق پرست انسان گزرے ہیں۔

فراقؔ صاحب سے نورالحسن ہاشمی کی ملاقات کا ذکر آپ کے سامنے لانے کا مقصد ان کی اردو نوازی اور اردو زبان کی طرف مائل ہونے کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔نورالحسن ہاشمی سے ملاقات کے دوران ہوئی گفتگو میں ایک جگہ فراقؔ صاحب فرماتے ہیں کہ 18 یا 19 برس کی عمر میں یہ محسوس کیا کہ جانتا تو میں تھوڑی سی اردو تھا لیکن میرے کان میں اور ہندوستان کی زبانوں میں بھنک تو پڑ جاتی تھی۔دو غیر یو، پی والوں کے بات چیت کرتے کہ کسی نہ کسی معنوں میں سب سے زیادہ متمدن ترقی یافتہ ریورس فل تو نگر زبان،ہماری زبان،ہاشمی صاحب،جی جی،فراقؔ صاحب : ہم سنسکرت سے نہیں عربی سے نہیں،مقابلہ کرتے گریکسن سے نہیں کرتے۔مگر یہ بڑی زبان ہم ایسے چھوٹے ہوئے ہم نے اس کو حاصل کیا کہ ہم نے سیکڑوں برس تک اس میں باتیں چھوٹی ہی کیں۔

ہاشمی صاحب: جی،جی ہاں،خوب کہا۔فراقؔ صاحب بڑی زبان میں چھوٹی بات کہنا،یہ کچھ زیب نہیں دیتا۔اس طرح دیگر زبانوں کے علم اور ان کے اسناد حاصل کرنے ہندوستان کو سمجھنے میں جو معاونت ملی ان پر نورالحسن ہاشمی سے کھل کر گفتگو کرتے ہوئے اردو کی ستائش کی۔یہ تھے وہ فراقؔ صاحب جو آج بھی دلوں میں بستے ہیں۔فراقؔ صاحب کے بارے میں اس قدر تفصیل سے معلومات اپنے اس مضمون میں داخل کرنے کا ایک معقول جواز میرے پاس یہ بھی ہے کہ فراق صاحب کے حوالے سے قومی آواز اخبار کے ذریعے جو خبریں ومضامین میرے مطالعہ سے گزرے انہیں آج تک سنبھالا ہوا ہے۔دوسری بات یہ کہ فراق صاحب سے چونکہ میری کئی ملاقاتیں رہی ہیں اس لیے میں نے انہیں جس قدر اور جن جن حالات میں جیسا پایا ویسا نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

فراقؔ صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے بارے میں آئیے میں بھی کچھ ذاتی طور پر بتاتا چلوں،تاکہ سخن فہمی کی بنیاد پر مجھے جو غلط فہمی خود کی ذات سے ہوئی ہے اس کا ازالہ ہوسکے۔جہاں تک میرا خیال ہے فراقؔ صاحب بھی دیگر شعرا کی طرح اردو زبان کے گرویدہ ہوئے،ان کی شاعری کئی صدی کے تجربوں کی شاعری ہے۔فراقؔ انگریزی شاعری کے رموز واسرار سے پوری طرح آشنا تھے۔انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ انگریزی اور ہندی سے استفادہ اٹھا کر اردو میں شاعری کی جائے جس میں وہ بے حد کامیاب رہے ہیں مگر فراق نے اپنا اسلوب اور لب ولہجہ برقرار رکھا اس لئے اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ موجودہ شاعری ہماری شاعری کا حصہ نہیں رہا۔

فراق صاحب نے اردو میں عشقیہ شاعری اور ہندوستانی تصور جمال کی ترجمانی نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے کی ہے۔گویا کہ فراق صاحب نے غزل کی مروجہ روایت سے کام لیا ہے۔تاہم اردو غزل کو ایک نیا مزاج دینے میں اور اس کی ساخت و برداخت میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ان کی فنکارانہ عظمت کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کی روایت کو نئی بلندیاں عطا کی ہیں۔جگہ جگہ ان میں ایک نئی فضا اور نئے عزائم کا احساس ہوتا ہے۔فراقؔ صاحب کی شاعری کا میں ہی اکیلا طرفدار نہیں ہوں،بہت سے مداحوں میں ایک نام ندا فاضلی کا بھی ہے،ندا فاضلی نے ایک خط فراقؔ گورکھپوری صاحب کو لکھا جسے یادگار کے طور پر شامل تحریر کر رہا ہوں۔ندا فاضلی کے الفاظ۔ برادرم اسلام،صاحب،خط ملا شکریہ۔نظم تو اس وقت ممکن نہیں ہے۔فراق صاحب کے بارے میں اپنی رائے مختصراً پیش کر رہا ہوں،رسید سے نوازیں،امید ہے اچھے ہی ہوں گے۔خیر طلب ندا فاضلی۔

فراقؔ بڑے دائرے کے بڑے شاعر ہیں۔اسے اردو کی خوش قسمتی کہیے کہ فراقؔ نے اسی غزل کو اپنی شخصیت کی روشنی سے منور کیا جسے حالیؔ کے اصلاحی جنون نے بے عزت کرکے ادب بدر کیا اور بعد میں ترقی پسندوں نے اس کی گردن مارنے کا اعلان نامہ صادر فرمایا۔غزل کی جاندار روایات کی نئی دریافت فراقؔ کا اہم کارنامہ ہے۔انہوں نے غزل کو ہم عصر اکثر ذہنوں کی سطحیت سے ہی آزاد نہیں کیا،اسے ایک ایسا جیتا جاگتا ذہن بھی عطا کیا جو اپنے عہد میں ممتاز ہونے کے ساتھ آنے والے دَور کے امکانات کی بشارت بھی سناتا ہے۔

غزل کے وہ جانے پہچانے کردار جو بڑی حد تک جنسی گھٹن کے چونچلوں اور دور دور کی مریضانہ عاشقی کے شکار تھے،فراقؔ کے یہاں سماجی شائستگی اور انسانی تہذیب کے مناظر ہیں جو زندہ علامتیں بن کر ابھرتے ہیں۔یوں تو فراقؔ نے شعری زبان میں نظم کے اچھے شاعروں کی طرح کسی نمایاں اجتہاد کا ثبوت نہیں دیا لیکن وہی الفاظ،تراکیب جو دیگر شاعروں کی غزلوں میں روایت زدہ اور فرسودہ محسوس ہوتے ہیں،فراقؔ کی غزل میں فراقؔ کی شخصیت کی طرح وسیع اور تہہ دار بن جاتے ہیں۔

فراقؔ کی غزل جذبہ کو ذہن اور ذہن کو احساس میں تبدیل کرنے کا ایک انوکھا تجربہ ہے،اسی تجربہ نے ان کی غزل کو ایک ایسے آفاقی مزاج سے روشناس کیا ہے جو غالبؔ و میرؔ کے بعد اردو غزل کی تیسری غزل کہی جاسکتی ہے۔اور جو ہم سے ہمارے عہد سے زیادہ قریب اور مانوس ہے۔فراقؔ نے صرف غزل کہہ کر ہی اردو شاعری پر احسان نہیں کیا بلکہ صنف غزل کی مجموعی فضا کی نئی تعمیر میں جو ان کا رول رہا ہے وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔نئی غزل کو بنانے سنوارنے میں یگانہؔ کے ساتھ فراقؔ کا نام بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

ندا فاضلی

فراق صاحب کے فن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس فضا کو نئی جمالیات کے رنگ و بو کے ساتھ غزل کا مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ان کی اپنی آواز ہے۔ان کا اپنا الگ اسلوب ہے اور اپنا الگ لہجہ ہے،جس کی وجہ سے وہ اردو میں جانے و پہچانے شاعر ہیں۔

فراق صاحب کو اس تعلق سے اپنا خون جگر صرف کرنا پڑا ہے۔ان کی شاعری نئی صدی کے تجربوں کی شاعری ہے۔فراقؔ صاحب چونکہ تعلیم یافتہ تھے اس لیے اکتسابی عمل سے جو فیض وعرفان انہیں حاصل ہوا اس کا بھی بھرپور استعمال انہوں نے اپنی شاعری میں کیا۔جس بھی مسئلہ یا معاملہ نیز کشمش کے المیہ پر انہوں نے شاعرانہ نظر کی اس کا تدارک اپنی فکر اور شعور کی بنیاد پر پختگی کے ساتھ پیش کیا۔فراقؔ صاحب نے شاعری صرف دل بہلانے دوسروں کو رجھانے کا ذریعہ نہیں بنائی،اسی لیے میری نظر میں زندگی کے مسائل کا حل ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے،اور وہ مجھے انسانیت کے اعلیٰ مُدارج پر فائز نظر آتے ہیں۔

❑❑❑

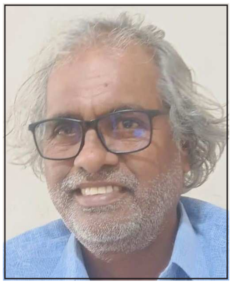

ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر

گلشن حیدر، شانتی نگر۔ ضلع۔ دیوریا

9415276138

ڈاکٹر اختر بستوی: شخص اور شاعر

اگر دنیا کی ناثباتی کا اندازہ لگانا ہو تو ہمیں پروفیسر اختر بستوی کی حیات اور کارناموں کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ تاریخ کے دبیز صفحہ پر کئی ایسی شخصیات کا ذکر مل جائے گا، جس میں انسان اپنی محنت اور لگن سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ ان میں کچھ نے اپنی وراثت بہت سلیقے سے منتقل کی۔ لیکن کچھ شخصیات کے دنیا سے اٹھنے کے بعد اس کی سلطنت بالکل بکھر گئی۔ ان میں ایک اہم شخصیت سلطان جلال الدین خلجی کا تھا جو غیاث الدین بلبن کی فوج میں ہرکارے کا کام کرتا تھا اور وہ بلبن کی وفات کے چار سالوں کے اندر ہی دلی کا سلطان بن بیٹھا۔ سلطان جلال الدین خلجی اپنے ابتدائی دنوں میں جب وہ ملتان کا گورنر تھا، بلبن کے محافظ دستے کے سالار امیر علی سر جاندار کو سلام کرنے کے لئے دربار کے ایک ستون کے پیچھے دیر تک کھڑا رہتا، تاکہ وہ ایک بار اس کی طرف دیکھ لے اور وہ سلام کر سکے، مگر ایسے مواقع بہت کم ہی آتے تھے۔ غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد اس کے خاندان کے ایک ایک بچے کو چن چن کر قتل کر دیا گیا اور جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد اس کے بھتیجے نے بھی اپنے چچا کی اولادوں کے ساتھ یہی رویہ اپنایا۔ اس معاملے میں غیاث الدین تغلق بہت خوش قسمت تھا، وہ ایک سپاہی سے سلطان کی گدی پر قابض ہو گیا اور اس کی وراثت کو اس کے بیٹے محمد بن تغلق نے استحکام و دوام بخشا۔ اگر دیکھا جائے تو اختر بستوی کی زندگی جلال الدین خلجی کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ ایک کلرک، اسکول ٹیچر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہونے تک ان کی زندگی کا سفر ایک پری خانے کی داستان جیسی پرکشش رہی۔

ہمیں پروفیسر اختر بستوی کی سوانح کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں صرف کام کیا۔ جہد مسلسل اور مشقت پیہم نے انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر کی آخری منزل تک ضرور پہنچا دیا، مگر اس درمیان ان کے ہاتھوں سے بہت کچھ چھن چکا تھا۔ اس میں ان کی وراثت کا مسئلہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ انہیں شادی کرنے کی فرصت نہیں ملی اور بعد میں دیکھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی وراثت سنبھالنے والا کوئی نہیں بچا۔ ان کی بیش قیمتی کتابیں جنہیں وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دست برد زمانہ ہو گئیں۔ شادی نہ کرنے کے لئے اختر صاحب کے پاس کئی دلیلیں تھیں۔ ان کے احباب، نئے طلبہ اور دیگر افراد شادی نہ کرنے کے متعلق اکثر ان سے تفتیش کرتے رہتے تھے اور وہ ہر شخص سے اس کی ادراک اور فہم و فراست کے مطابق الگ الگ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ لیکن اپنے شعری مجموعہ پیکر خیال کا انتساب جب انہوں نے 'ش' کے نام سے کیا تو ارباب و احباب میں سرگوشیاں کافی واضح ہو گئیں۔ ''ش'' کے نام جس کا پیکر اب میرے لئے عالم اجسام کی چیز نہیں رہ گیا ہے بلکہ خیال و احساس کی دنیا پر ایک کیفیت، ایک تاثر بن کے چھا گیا ہے۔'' ڈاکٹر شفیع ایوب کے مطابق:

> ''وہ اکثر کلاس میں ایک صراحی دار گردن کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے۔ ایک روز کلاس میں بتانے لگے کہ میری خالہ کی بیٹی تھی، نہایت حسین و جمیل، لمبی صراحی دار گردن تھی اس کی۔ جب شربت روح افزا پیتی تو گردن سے شکم کی طرف جاتے ہوئے ہم شربت کا رنگ دیکھ کر حیران ہوتے۔''[1]

محمد اختر علی صدیقی موسوم بہ اختر بستوی کی ولادت 8/ اگست 1938 کو بستی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد اصغر علی صدیقی علم پرور، نیک اور فعال انسان تھے۔ سماجی فکر اور تعلیمی فروغ کا جذبہ ان کے خمیر میں تھا۔ ان کی شخصیت کی چھاپ اختر بستوی پر

> ''اختر بستوی کی شاعری فکر اور احساس سے بوجھل ہوتی ہے۔ چاہے وہ حسن و عشق کی ترجمانی ہو چاہے غم روزگار کی کسک۔ وہ جیسے بھی خیالات ظاہر کرتے ہیں ان میں گہری معنویت، سنجیدگی اور رمز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کی تازگی ہمیں اس کی فکری میلانات کی موجوں میں غوطے لگانے کے لئے بے چین کرتی ہے۔ نغمہ شب سے لے کر اپنے سائے کے سوا تک تمام نظموں میں فکری تازگی ان کی اصل پہچان ہے۔ دراصل اختر بستوی نئی فکر نئے رجحان اور نئی ہنرمندی کے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے میں آہستگی اور نفاست ہے۔ یہ وہی نفاست ہے جو ان کی شخصیت کا ایک امٹ حصہ ہے۔ ان کی شاعری میں غنائیت ہے، جسے پڑھ کر قاری کو اپنے دل کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے قطعات کے مجموعہ پیکر خیال میں 154 قطعات شامل ہیں، جن کو انہوں نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ 80 فکری قطعات پر مبنی ہے جس کو انہوں نے 'دامن عقل و ہوش' کا عنوان دیا ہے۔''

براہ راست پڑی۔اختر بستوی بہت خوبصورت انسان نہیں تھے۔مگر وہ بہت نفیس، پرکشش اورمرعوب کن شخصیت کے مالک تھے۔وہ نہ صرف ہردلعزیز شاعر تھے اورمشاعرہ لوٹ لینے کی جادوگری جانتے تھے، بلکہ وہ اعلیٰ درجے کے دانشور بھی تھے۔وہ بلند پایہ خطیب تھے اور جب وہ کسی موضوع پر لب کھولتے تو مجمع محو حیرت ہو جاتا۔کبھی موضوع ان پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ وہ خود موضوع پر حاوی ہو جاتے اور سامنے والے کو بولنے کا موقعہ دیے بغیر اپنی دلیلوں سے اسے لاجواب کر دیتے۔ان کی کشش اور ان کا شخصی رعب ان کی انفرادیت سے مربوط تھی۔ان کی انوکھی اور دلکش شخصیت سے حسن، زیبائش و نگارشات کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ان کے لباس، طعام اور غسل میں بھی کچھ ایسی مخصوص انفرادیت تھی، جو انہیں گورکھپور یونیورسٹی کیمپس ہی میں نہیں بلکہ شہر گورکھپور اور بستی میں بھی منفرد unique بناتی تھی۔بقول غلام رضوی گردش:

”میانہ بلکہ قدرے پستہ قد، گندمی رنگ، گٹھیلا بدن، بیضوی چہرہ،
چپٹی ناک اور موٹے موٹے ہونٹ بظاہر بے حس آنکھوں پر موٹے
کالے فریم کا چشمہ، کلا جبڑا ایسا جسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے
پہلوان سخن استاد امام بخش ناسخ کے اکھاڑے سے تعلق ہو اوپر اٹھی
ہوئی کشادہ پیشانی جسے دیکھ کر سر بلندی کا احساس ہوتا ہے۔“[2]

بستی کے گاندھی نگر پکے پر واقع ان کے قدیم وضع قطع کا خوبصورت گھر 'روشن محل'، جو کبھی اہل علم وادب اور اعلیٰ شاعری کا مرکز ہوا کرتا تھا، جہاں بڑے بڑے ادیب اور شاعر پہنچ کر فخر محسوس کیا کرتے تھے اور اختر صاحب کی پرلطف انداز گفتگو کا حصہ بنتے تھے، اب ویران ہے۔

مکاں میراث میں اختر ملا ہے کیا عجب مجھ کو
یہ وہ روشن محل ہے جس کی دیواریں ہیں کجلائی

دراصل لکھنے پڑھنے اور درس وتدریس میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ صرف شادی ہی نہیں بلکہ ان کا ذہن روشن محل کی دیواروں پر چونا کلی کرانے اور اس کی ٹوٹی ہوئی برجیوں اور شکستہ دیواروں کے اکھڑے پلستر کو درست کرانے کی طرف کبھی آمادہ نہیں ہوا۔بقول اختر بستوی وہ اپنی نظموں اور غزلوں کی نوک پلک درست کریں یا مکان کی مرمت جیسے غیر شاعرانہ کام انجام دیں۔آج یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ روشن محل میں کپڑوں کا ایک تاجر آباد ہو گیا ہے اور جس کمرے میں وہ شعر ونغمہ کی محفلیں سجایا کرتے تھے، اس کمرے کو اس نے ہوزری کے سامان سے بھر دیا ہے۔ایسا لگتا ہے، جیسے اس تاجر کے جسم میں ان کی روح حلول کر گئی ہے۔تاجر بلاوجہ شعر پڑھتا رہتا ہے اور ہر دس منٹ بعد وضو، بدھنے اور نماز کی برکات اور فضائل کے علاوہ اپنی، پرہیزگاری، صبر وتحمل اور تقوی کی خود اکتسابی کا فخریہ انداز میں اظہار کر کے سامنے والے کی طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے۔اللہ اس کی علمیت اور دینداری کی نمائش سے ہرکس وناکس کو محفوظ رکھے۔اختر صاحب کی بیش قیمتی کتابوں میں سے جو کچھ امتداد زمانہ کی گردشوں سے بچی رہ گئی ہیں۔انہیں ان کے محل نما حویلی کے کسی دریچے میں مقفل کر دیا گیا ہے اور اس کی چابھی ان کے بھتیجے مونو کے پاس ہے، جو اعظم گڑھ میں کہیں سیاحتی ایجنسی travelling agency چلاتے ہیں۔خدا جانے باقی ماندہ اس بیش قیمتی سرمائے کا کیا بن رہا ہوگا۔

اختر صاحب نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گھر کی مالی حالت بہت خراب تھی۔سترہ سال کی عمر میں ان کے والد اصغر علی صدیقی کا انتقال ہو گیا تھا۔1955 میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہی قاضی عدیل عباسی کی خصوصی عنایت کی وجہ سے خیر انٹر کالج بستی میں ملازمت مل گئی تھی۔قاضی عدیل عباسی کی ان کے والد سے جذباتی انسیت تھی اور وہ اختر صاحب کی محنت اور لگن سے بھی بہت متاثر تھے۔والد کے انتقال کے بعد ان کے گھر کی دیکھ بھال کی طرف خصوصی توجہ قاضی صاحب کی ہمدردانہ اور فطری بناوٹ کا متقاضی تھا۔گھر کی اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے قاضی صاحب کی ہدایت پر اختر صاحب نے خیر کالج میں نوکری تو ضرور کر لی، لیکن ان کے دل میں حصول علم کا جذبہ کبھی سرد نہیں ہوا۔اختر بستوی ملازمت کے ساتھ ساتھ مسلسل پڑھتے رہے اور علمی اکتسابات بھی کرتے رہے۔جیسے ہی انہوں نے بی اے کیا انہیں ہائی اسکول کے بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے ترقی دے دی گئی اور جب انہوں نے انگریزی سے امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم اے کیا تو کالج انتظامیہ نے انہیں انگریزی کے لکچرار کے طور پر ترقی دے دی۔اسی زمانے میں انہوں نے Immortal literary works کے عنوان سے ایم اے فائنل انگریزی کے طلبہ کے لئے ایک کتاب لکھی، جس میں انہوں نے انگریزی کی 185 نایاب کتابوں پر مختصر تبصرہ Abstract review پیش کیا ہے۔اس کتاب کو لٹریری پبلی کیشنز بریلی نے شائع کیا تھا۔اس زمانے میں وہ خیر انٹر کالج میں لکچرار تھے۔مگر کتاب کے سرورق پر انہوں نے پروفیسر اختر بستوی لکھا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہدہ پر پہنچنے کی ان کی خواہش کتنی شدت اختیار کر چکی تھی۔ملک کے معیاری ادبی رسائل وجرائد میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہیں اس لئے جلد ہی پروفیسر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی کی نظر خلوص ان کی طرف مبذول ہوگئی اور انہوں نے اختر بستوی کو اردو سے ایم اے کرنے کا مشورہ دیا۔امتیازی نمبروں سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے 1979 میں سیکولرزم اور اردو شاعری کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کیا۔1980 پروفیسر محمود الٰہی کی نوازشات اور عنایات کی بارش ہوئی اور انہیں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بطور لکچرار تقرر کر لیا گیا۔ڈاکٹر اختر بستوی اپنی منزل کو خیر کالج کے زمانے سے ہی پہچانتے تھے۔خیر کالج کے ان کے کئی ساتھی مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاریاں کر کے الگ الگ محکموں میں افسر بن چکے تھے۔مگر اختر بستوی کا ذہن افسری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔انہوں نے مسلسل پڑھا اور لکھا اور کبھی دنیاوی لذتوں کی طرف خود کو راغب نہیں کیا، جو انہیں دولت اور آسائش فراہم کر سکتی تھی۔

اپنی ساری منفرد اداؤں کی طرح لباس کے معاملے میں ڈاکٹر اختر بستوی بہت محتاط رہتے تھے۔چاہے سردی ہو یا گرمی وہ اپنے سوتی شرٹ کا اوپری بٹن ضرور بند کرتے۔جاڑے کے دنوں میں اسی شرٹ پر کوٹ ڈال لیتے تھے، مگر پینٹ ہمیشہ سفید کھادی کا ہی پہنتے۔بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ پورے ملک میں اس طرح کا لباس صرف اختر بستوی زیب تن کرتے تھے اور ان کے جسم پر وہ لباس بہت پھبتا بھی تھا۔وہ گاندھی آشرم سے کھادی کا ایک تھان موٹا کپڑا خریدتے اور بستی کے مخصوص درزی سے ایک بار میں ایک درجن سے زیادہ پینٹ اور شرٹ سلواتے تھے۔ان کے کپڑے بھی مخصوص دھوبی ہی دھلتا تھا۔کسی دوسرے دھوبی سے زندگی میں کبھی کپڑا نہیں دھلوایا۔مخصوص دھوبی، مخصوص درزی، مخصوص ہوٹل اور مخصوص حکیم ان کا ہر انداز خاص ہوتا تھا۔اسی خصوصیت نے ان کی شخصیت کو منفرد بنایا تھا اور اسی نے ان کی جان لے لی۔اپریل 1998 کی ایک صبح انہیں اپنی جانگھ کے اوپری حصے میں درد اور چبھن کا احساس ہوا۔ان دنوں وہ بستی میں تھے۔شام کو وہ اپنے آبائی اور مخصوص حکیم جی کے پاس گئے۔حکیم جی نے دیکھا کہ ان کی جانگھ پر ایک چھوٹی بے ضرر پھنسی اگ آئی ہے۔انہوں نے کچھ دواؤں کی پڑیا دی اور دوسرے دن بلا کر اپنے زنگ آلود نشتر سے اس پھنسی میں ایک چیرا لگا کر

پٹی باندھ دی۔ تیسرے دن بجائے افاقہ کے ان کی تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ انہیں صدر اسپتال میں بھرتی کرایا گیا۔ پھوڑے میں سڑن اور بدبو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ کوئی زہر تھا جو تیزی سے ان کے نازک جسم میں سرائت کر رہا تھا۔ صدر اسپتال کے ڈاکٹروں نے انہیں گورکھپور کے معروف سرجن ڈاکٹر وجاہت کریم کے یہاں ریفر کر دیا لیکن اس وقت تک ان کی جانگھ سڑنے لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ انہیں سپٹک septic ہوگیا ہے۔ دو ہفتے کے اندر ان کے جسم سے ناقابل برداشت بدبو اٹھنے لگی۔ ڈاکٹر بے بس نظر آرہے تھے۔ ان کے زخم پر کوئی دوا کارگر نہیں ہو پا رہی تھی۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ ان پر جاں نثار کرنے والے طلبا، بھائی اور بھاوج تک ان کے قریب نہیں جا پا رہے تھے۔ یہ خبر جس نے بھی سنی وہ و اسٹار اسپتال کی طرف دوڑا۔ مگر ناک پر رومال رکھ کر بھی ان کے کمرے میں جا پانا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ 10 جون 1998 کو اسی حالت میں ان کی وفات ہوگئی۔

جب کبھی رئیس گورکھپور اور محبان اردو حامد علی صاحب ان کے گھر تشریف لاتے تو وہ ان کے آگے بچھ سے جاتے تھے۔ وہ اپنے گھر پر ان کا والہانہ اور گرم جوشی warmful سے استقبال کرتے۔ فوراً چائے کی کیتلی ہیٹر پر رکھ دیتے۔ اگر کوئی ریسرچ اسکالر وہاں موجود ہوتا تو اسے فوراً سے پیشتر نخاس پر کباب اور شیر مال لانے کے لئے دوڑا دیتے۔ کیسا شیر مال اور کباب ہو، یا کس دوکان سے لایئے گا، وہ اپنے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے۔ طلبہ سے چاہے جتنی بھی بے تکلفی ہو جائے وہ کبھی تم پر نہیں آتے تھے۔] اس کی تفصیل بتانے کے لئے زینہ تک اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے جاتے۔ اکثر حامد علی صاحب خود بھی اپنے ساتھ خورد ونوش کی چیزیں لاتے تھے۔ حامد صاحب پان بہت کھاتے تھے۔ اختر صاحب کو پان سے شدید نفرت تھی۔ اس کے باوجود ان کے لئے بطور خاص گھر میں پیک دان رکھتے تھے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں سمجھ پائے کہ لوگ آخر کار پان کھاتے ہی کیوں ہیں؟ اور کھاتے ہیں تو تھوکتے کیوں ہیں؟ پان کو درکنار کر دیا جائے تو دونوں میں حیران کن مفاہمت تھی۔ ان دونوں میں گھنٹوں راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہتیں۔ کبھی کبھی گفتگو کے درمیان ادبی مباحثے بھی اپنی چونچ نکالنے لگتے۔ جن پر اختر صاحب اکثر نا اتفاقی ظاہر کرتے۔ جلال الدین خلجی کی طرح حامد صاحب شاعر نہیں تھے مگر اچھی شاعری پہچاننے کی ان کے اندر غضب کی صلاحیت موجود تھی۔ اختر صاحب شہر میں صرف دو لوگوں کو خاطر میں لاتے تھے اور اپنی شخصی باریابی سے انہیں مستفیض بھی کرتے تھے۔ ان میں ایک تو حامد علی صاحب تھے اور دوسرے 4 پروفیسر کالونی کے مکین ان کے استاد پروفیسر محمود الٰہی صاحب، جنہیں وہ شریف النفس انسان کہتے تھے۔ بالکل فرشتہ صفت۔ محمود الٰہی صاحب کے سامنے وہ ایسے جھک جاتے جیسے پھلوں سے لدی ہوئی انگور کی بیلیں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ استاد اعظم پروفیسر محمود الٰہی صاحب صرف ان کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے شہر کے لئے معزز اور مکرم تھے۔

ان کے زندگی گزارنے کا انداز اتنا منفرد اور پرکشش تھا کہ وہ شہر گورکھپور میں ہمیشہ موضوع بحث بنے رہتے۔ گورکھپور کے کسی شعری نشست میں شریک نہ ہونے اور شعرا و ادبا کے ساتھ ہی یہاں کے اہم اخبار اشتراک کی کھلے عام تضحیک کرنے کی وجہ سے ایم کوٹھیاوی راہی اس قدر برہم ہوئے کہ انہوں نے اشتراک میں 'خنجر پستوی' کے عنوان سے مستقل فکاہیہ کالم شروع کر دیا۔ یہ کالم فرضی نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں خنجر پستوی کو الگ الگ طور طریقے اور الگ الگ حالات میں الگ الگ طریقے سے گفتگو کرتے ہوئے پیش کیا جاتا تھا۔ کبھی خنجر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سوئی ہوئی عورتوں کو نہارتے ہیں۔ کبھی رات کی تنہائی میں کسی نالے میں گرے پڑے دکھائی دیتے۔ کبھی گلی کے کتے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ کبھی شہر کے اوباش لڑکوں کے ساتھ کیرم کھیل رہے ہیں۔ اسٹیشن روڈ پر ایک ہوٹل نے فکس ریٹ پر اپنی تھالی کی اسکیم اس لئے بند کر دی کہ جب خنجر بستوی کھانے بیٹھتے ہیں تو اس کی ساری دیگیں خالی کر کے اٹھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ایک سال کے اندر اس فکاہیہ کالم کی پچیس سے زیادہ قسطیں شائع ہوئیں۔ اس کالم کی اشاعت کے بعد اختر صاحب کے چہرے پر تفکرات کے بادل صاف دیکھے گئے۔ راہی صاحب نے اپنے زور بیان سے اس کالم کو بہت طول دے دیا۔ پورے شہر میں خنجر پستوی کا ذکر عام ہوگیا۔ اس کے بعد اختر بستوی مذاق کا موضوع بن گئے۔ ایک وقت ایسا آیا جب اختر صاحب خود کو بالکل بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے خود کو مظلوم victim ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے طلبہ کے جذبات کو برانگیختہ کر دیتے۔ کئی طلبہ کے غصے کی آگ بھڑک جاتی اور وہ اس بات کے لئے تیار ہو جاتے کہ راہی صاحب کو پیٹ دیا جائے تو وہ خود بیچ میں آجاتے اور تمام اخلاقی تقاضوں پر واعظ کر کے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کر دیتے۔ ایک طرف وہ طلبہ کے سامنے اپنی مظلومیت کا اظہار کرتے اور دوسری طرف جب طلبہ کو غصہ آجاتا تو وہ ان کے سامنے سرخرو بھی بن جاتے۔

اختر بستوی نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ لکھا۔ ایک وقت تھا جب وہ ملک کے تمام مشہور و معروف رسائل و جرائد کی رونق ہوا کرتے تھے۔ جن رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں، انہیں وہ اپنی میز پر سجا کر رکھتے تھے۔ انہوں نے جتنا کچھ بھی لکھا، کتابی شکل میں اس کی اشاعت چوتھائی مقدار میں بھی نہیں ہو پائی۔ ان کی ناگہانی وفات کی وجہ سے ان کا اشاعتی منصوبہ نامکمل رہ گیا۔ ان کی وفات کی وجہ سے ان کی سیکڑوں کی تعداد میں غزلوں کی اشاعت ممکن نہیں ہو پائی، جو ان کی بیاض اور ملک کے مختلف رسائل و جرائد کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں۔ اپنی زندگی میں انہوں نے صرف نظموں اور انیس مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہی شائع کرایا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ٹیڑھے نشانے' ان کی وفات کے بعد 2002 میں شائع ہو سکا۔ انہوں نے ٹیڑھے نشانے کا مسودہ اپنی زندگی میں ہی جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی کو بغرض اشاعت بھیج دیا تھا لیکن یہ کتاب ان کی وفات کے چار سال بعد شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس میں کل انیس مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ دلیپ کمار سبزی منڈی میں، مرزا غالب ایک فلمی انٹرویو میں، مکان کے لئے نام چاہئے، حسن اور ترکاری، آگرہ کے تاج محل سے ممبئی کے تاج محل تک، جیسے خالص مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔

وہ بہت ضخیم کتاب بھی شائع کرانے کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے 1969 میں نغمہ شب شائع کیا تو اس میں صرف ایک نظم شامل کیا، جس کا نام نغمہ شب تھا۔ یعنی 101 بندوں پر مشتمل صرف 404 مصرعہ۔ 1970 میں ان کے 154 قطعات کا مجموعہ پیکر خیال شائع ہوا۔ پیکر خیال دوسری بار 1974 میں بھی شائع ہوا۔ اسی سال ان کی ایک دوسری طویل نظم بحر بیکراں شائع ہوئی۔ یہ طویل نظم بھی نغمہ شب سے بڑی نہیں ہے، مگر اس میں انہوں نے مختلف تجربات و احساسات کو شامل کیا ہے۔ 1980 تک وہ سیکولرزم اور اردو شاعری پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے رہے، جو 1996 میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ 500 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1983 میں انہوں نے محمد علی جوہر کی شاعری کا انتخاب سخن جوہر شائع کیا، جو 118 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1989 میں ان کی ایک سو ایک مختصر نظموں کا مجموعہ اپنے سائے کے سوا شائع ہوا۔ اس شعری مجموعہ کی ضخامت

118 صفحہ کی ہے۔اسی دوران وہ فانی کی شاعری کا انتخاب شائع کرنے کی تگ و دو کرتے رہے اور 1995 میں فانی بدایونی کی شاعری اور شخصیت پر ایک بلیغ مقالہ لکھ کر 'انتخاب فانی' شائع کیا۔اس کی ضخامت 103 صفحہ کی ہے۔ 1997 میں قاضی محمد عدیل عباسی کی شخصیت اور کارناموں پر ایک بلیغ مونوگراف شائع کیا' جس کی ضخامت 96 صفحے کی ہے۔

نثری کارناموں میں ان کا تحقیقی مقالہ ''سیکولرزم اور اردو شاعری'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس کتاب کو اردو اکادمی لکھنؤ نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔اس میں انہوں نے اردو شاعری اور سیکولرزم کا وسیع مطالعہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اس موضوع کو آٹھ ابواب میں تقسیم کر کے اس کے ہر پہلو کو انتہائی جامع اور باریک بینی سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔سیکولرزم کا مفہوم' اردو شاعری کی سیکولر بنیادیں اور اس کے علاوہ اردو غزل' مثنوی قصائد مرثیہ رباعیاں اور نظموں میں سیکولر مزاج و مفہوم کا وسیع و بسیط مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے موضوع میں کس قدر ڈوب کر کام کرتے تھے۔اس کتاب کی نثر ان کی نثری انفرادیت کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔اردو غزل کے سیکولر مزاج کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

''غزل کی زبان علامتوں کی زبان ہے۔اس کی لفظیات کا خزانہ علامتی الفاظ کے نگینوں پر مشتمل ہے' اور انہیں نگینوں کی چمک دمک سے اردو غزل کے مزاج و کردار کا اصل حسن آشکار ہوتا ہے۔ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کے لئے غزل کچھ ایسے لفظوں کا سہارا لیتی ہے' جو مخصوص علائم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔۔۔آج کے دور میں بھی' جب کہ بعض شعرا کے ہاتھوں غزل کی لفظیات میں زبردست شکست و ریخت ہو رہی ہے اور پرانے علامتی الفاظ کو ترک کر کے ان کی جگہ پر لفظوں کے نئے سانچے بنانے اور نئی علامتوں کو رواج دینے پر بیش از بیش توجہ دی جا رہی ہے' اردو غزل میں سیکولر خیالات کی نمائندگی کرنے والی مندرجہ بالا علامات نے اپنا وزن و وقار نہیں کھویا ہے۔''[3]

اردو شاعری میں اختر بستوی کی دھماکے دار انٹری نغمہ شب کے ذریعے ہوئی تھی۔وہ بہت تجرباتی اور انوکھی نظم ہے۔اس میں وزن اور وقار ہے۔ 35 سال کی عمر میں اتنی طویل اور پر اثر نظم کی اشاعت کے بعد شاعری کی دنیا میں انہوں نے نئی ہلچل پیدا کر دی۔اختر صاحب کی شاعری پر اقبال کی طویل نظموں جیسے 'خضر راہ' 'مسجد قرطبہ' اور 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کے اثرات کی بات کہی جاتی ہے' جیسا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے نغمہ شب کے پیش لفظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔''اختر صاحب کی طویل نظم 'نغمہ شب' اقبال کی نظم خضر راہ کی یاد دلاتی ہے۔طوالت بیان اور انداز فکر کے لحاظ سے بھی ان میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔اقبال نے حضرت خضر کی زبان سے دنیا و اہل دنیا کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور اختر صاحب نے رات کو شخص بنا کر اپنے خیال کا آئینہ دار کیا ہے۔یہ تقلید یا تخلیق باعث مسرت ہے۔''مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ انگریزی کے شاعروں سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں' جنہوں نے دو صدی قبل بہترین طویل نظمیں کہی تھیں۔اس ضمن میں ورڈس ورتھ' ٹی ایس ایلیٹ اور اولیور گولڈ اسمتھ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔اختر بستوی رات کی دیوی کی پرستش کرتے نظر آتے ہیں۔رات کو ایک محبوبہ کی طرح پیش کرنا' ان کی فنکارانہ جدت تھی۔اس بات کو پروفیسر احتشام حسین کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

''نظم کا اصل موضوع زندگی ہے' جو حسین بھی ہے اور بدصورت بھی' جس میں نغمہ بھی ہے فریاد بھی' جسے اپنے فکری لمحوں میں ہر صاحب دل محسوس کرتا ہے۔اختر بستوی نے انہیں خیالات کو زبان دے دی ہے اور بڑے خلوص سے اپنی بصیرت کے مطابق زندگی کے مختلف مناظر کو شاعرانہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔رات شاعر کی زبان سے اپنے دامن میں چھپی ہوئی عریانیوں' بے عنوانیوں اور رنگینیوں کی صورت گری موثر انداز میں کرتی ہے۔''[4]

اختر بستوی کی شاعری فکر اور احساس سے بوجھل ہوتی ہے۔چاہے وہ حسن و عشق کی ترجمانی ہو چاہے غم روزگار کی کسک۔وہ جیسے بھی خیالات ظاہر کرتے ہیں ان میں گہری معنویت' سنجیدگی اور رمز پوشیدہ ہوتا ہے۔ان کی شاعری کی تازگی ہمیں اس کی فکری میلانات کی موجوں میں غوطے لگانے کے لئے بے چین کرتی ہے۔نغمہ شب سے لے کر اپنے سائے کے سوا تک تمام نظموں میں فکری تازگی ان کی اصل پہچان ہے۔دراصل اختر بستوی نئی فکر نئے رجحان اور نئی ہنرمندی کے شاعر ہیں۔ان کے لہجے میں آہستگی اور نفاست ہے۔یہ وہی نفاست ہے جو ان کی شخصیت کا ایک امٹ حصہ ہے۔ان کی شاعری میں غنائیت ہے' جسے پڑھ کر قاری کو اپنے دل کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے قطعات کے مجموعہ پیکر خیال میں 154 قطعات شامل ہیں' جن کو انہوں نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔پہلا حصہ 80 فکری قطعات پر مبنی ہے جس کو انہوں نے 'دامن عقل و ہوش' کا عنوان دیا ہے۔دوسرے حصہ کا عنوان ہے 'کف گل فروش'۔یہ رومانی قطعات ہیں ان میں کل 74 قطعات شامل ہیں۔ان کے قطعات عشق اور عقل کے موضوعات پر مبنی ہیں۔دامن عقل و ہوش میں شامل قطعات ہمیں بھرتری ہری کی نیتی شتک کے دوہوں کی یاد دلاتے ہیں۔بالکل ایسا ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ ان کے قطعات نیتی شتک کے تراجم ہیں مگر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ نیتی شتک کے دوہوں سے کہیں نہ کہیں متاثر ضرور ہیں۔ڈاکٹر اختر بستوی کے دامن عقل و ہوش والے قطعات کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

فیصلے گر کسی انسان کے متزلزل ہوں
قوت فکر کی بنیاد ہلا دیتے ہیں
کچھ بھی سوچے کوئی لازم ہے تیقن اس میں
وسوسے ذہن کو کمزور بنا دیتے ہیں

دوسرے حصہ کف گل فروش میں ڈاکٹر اختر بستوی نے اپنی رومانی قطعات کو شامل کیا ہے۔یہ رومانی قطعات بھی بھرتری ہری کے شرنگار شتک کی یاد دلاتے ہیں۔بھرتری ہری سے ڈاکٹر اقبال بھی بہت متاثر تھے۔ڈاکٹر اختر بستوی کے قطعات پر بھی بھرتری ہری کا اثر کہیں زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔بھرتری ہری کا انداز کچھ اس طرح تھا۔[05]

روشن تھی مرے ذہن میں اک شمع آگہی
جلتی رہی جو وقت کی سرکش ہواؤں میں
آنکھوں میں تیری جانے یہ کیسا طلسم ہے
وہ شمع بجھ گئی تری پلکوں کی چھاؤں میں

دامن عقل و ہوش کی طرح کف گل فروش کے قطعات کا فکری پس منظر بھی بھرتری ہری کے شرنگار شتک سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔مگر اس طرح کی مماثلت کے باوجود

ان میں انوکھی انفرادیت ہے اور تازگی ہے اور یہی انفرادیت اور تازگی اختر بستوی کو اردو نظم میں نئی پہچان سے ہمکنار کرتی ہے۔انھوں نے اپنی کتاب پیکر خیال میں اس طرح کے 55 رومانی قطعات کو شامل کیا ہے۔ان کے اکثر قطعات انسانی روحوں کے تلذذ کا احساس کراتے ہیں۔ان میں نوجوانی کے ولولہ انگیز رومانی جوش کی ترجمانی صاف جھلکتی ہے۔ان میں بے انتہا تازگی اور لطافت ہے۔جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کے جسم اور اس کی روح سے کھیلنا چاہتا ہو۔ان قطعات میں خالص حسن کی نمائش ہے۔بعد کے دنوں میں اختر صاحب کے خیال میں گہرائی اور گیرائی شامل ہوتی گئی۔

مہ جبینوں لب و رخسار کی مے چھلکاؤ
ساغر چشم سے کردو مری توبہ کو شہید
مدتوں رکھے ہیں تقدیس کے روزے میں نے
اب یہ بہتر ہے کہ ہو جائے مری روح کی عید

بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اختر بستوی کی شاعری فکری اور تخیلاتی سطح پر ہمیشہ کسی نہ کسی خیال سے مربوط رہی ہے۔ان کی شاعری تک بندی نہیں ہے اور ان کی شاعری صرف شاعری کے لئے بھی نہیں ہے بلکہ ان میں کوئی پیغام ہے، کوئی روحانی تقاضہ ہے یا کوئی دلکش تصور احساس ہے، جسے وہ شعری لفظیات میں پیرو کر اسے پرکشش بناتے ہیں۔ان کی نظموں میں قاری کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔اپنے ذہن وفکر کو انھوں نے اسی نہج پر بیس سال بعد بھی قائم رکھا، جب وہ اپنی بہترین شعری کاوش 'اپنے سائے کے سوا' کی اشاعت کر رہے تھے۔وہ خیال وفکر ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا ان کا ذہن 1970 کی دہائی میں سوچ رہا تھا۔صرف بہترین نظموں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنے سائے کے سوا اپنی اعلیٰ طباعت اور اشاعت کی وجہ سے بھی بہترین شعری مجموعہ ہے۔وہ اپنی زندگی کے ہر گوشے کی طرح طباعت واشاعت میں بھی بے انتہا کمال پرست perfectionist تھے۔اپنی کمال پرستی سے مجبور وہ جو کچھ بھی شائع کراتے اس میں بے حد اہتمام سے کام لیتے۔کتابت سے لے کر طباعت تک ایک ایک فرما اور ایک صفحے کا خود معائنہ کرتے تھے۔انھوں نے بتا دیا کہ وہ گورکھپور میں بھی ایک دلکش حسین اور پرکشش کتاب کی طباعت کرا سکتے ہیں، جہاں دلی اور ممبئی کی طرح جدید اور معیاری اشاعت گھر نہیں ہیں۔

یہ کتاب ان کی جمالیاتی دلکشی کا بہترین نمونہ ہے۔اس کے تمام صفحات رنگین بیل بوٹوں سے مزین ہیں۔اس کی کتابت گورکھپور کے بہترین خطاط ڈاکٹر محمد شعیب ندیم گورکھپوری نے کی۔اس کا ٹائٹل کو راسلامیہ کالج کے ایک کہنہ مشق فنکار نے تیار کیا تھا۔اس کی طباعت حامد علی انصاری عرف ننھے صاحب کے آفسیٹ پریس میں ہوئی۔ننھے صاحب نے سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں چھاپیں، مگر انہیں اپنے سائے کے سوا کی اشاعت کے دوران ایک ایسے حساس اور جمال پرست انسان سے سابقہ پڑا، جس نے اپنے سامنے ایک ایک صفحے اور ایک ایک فرمے کی نگرانی کی۔کسی صفحے پر کسی نقطے کی سیاہی ہلکی تو نہیں کوئی لفظ ترچھا تو نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب کی نظریں چھوٹی سے چھوٹی بات پر جا کر ٹک جاتیں اور جہاں کہیں کوئی نقص نظر آتا ننھے صاحب کو اس فرما کو دوبارہ چھاپنا پڑتا تھا۔ننھے صاحب ڈاکٹر اختر بستوی کی پرشکوہ شخصیت کے سامنے بے بس نظر آتے۔ننھے صاحب بہت اعلیٰ درجے کے فنکار تھے اور اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، مگر انھوں نے طباعتی فنکاری کے بہت سے رموز ڈاکٹر اختر بستوی سے اخذ کیا۔

اپنے سائے کے سوا کی مختصر نظموں میں دوہوں جیسا فکری رجحان ملتا ہے۔ان نظموں کے مصرعوں کی تعداد کہیں چھ ہے کہیں آٹھ ہے اور کہیں کہیں دس تک ہے۔مگر اس کا تھیم ایک ہی ہے، وہی فلسفیانہ خیال، وہی اخلاقی پہلو، وہی معاشرتی نظام کی چاشنی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کے موضوعات کو اساطیری کہانیوں یا مذہبی اقوال زریں سے اخذ کیا ہے۔لیکن ان فلسفیانہ افکار وخیالات کو شعری لفظیات میں پیش کرنا ان کا فنی کمال ہے۔وہ پرانے خیالات کو بھی ندرت اور تازگی کے ساتھ پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور شاید یہی ان کا کمال excellent ہے۔اپنے سائے کے سوا کا پیش لفظ لکھتے ہوئے معروف شاعر کیفی اعظمی نے اس طرح کی صرف دو مثالیں دی ہیں، جن میں انھوں نے اساطیری افعال یا اقوال سے استفادہ کیا ہے۔انھوں نے بتایا کہ اس مجموعے میں شامل نظم 'افعال کا حاصل' گیتا کے کرم کے فلسفہ سے متاثر ہے۔جس میں سری کرشن نے کہا کہ 'کرم کئے جاؤ پھل کی چنتا نہ کرو'۔

کیفی صاحب کہتے ہیں کہ اختر بستوی نے اپنی نظم کے موضوع کے لئے غالب کے مذکورہ شعر سے اتنی باریکی سے استفادہ کیا ہے کہ عام قاری کو خیال بھی نہیں گزرے گا کہ وہ غالب کے اس شعر سے متاثر ہو کر اپنی نظم 'قربت اور دوری' کی زمین تیار کر رہے ہیں۔

بات یہ ان سب کے ہے مدنظر
آدمی سے ہوں سدا نزدیک تر
سب کو قرب انسان کا منظور ہے
آدمی ہی آدمی سے دور ہے

لیکن کیفی صاحب اس بات کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ اختر صاحب نے اس طرح کی نظم گوئی کی نئی روایت قائم کی ہے۔نظم کی اس نئی صنف میں، جسے اختر بستوی نے ایجاد کی ہے، انہیں اپنی بات کھل کر کہنے کی اجازت دیتی ہے۔اگر وہ رباعیوں اور قطعات میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو شاید قافیہ اور ردیف کی بندشوں میں جکڑ کر رہ جاتے اور کھل کر اپنی بات کہہ پانے میں بے بسی محسوس کرتے۔لیکن مختصر نظموں کے ان گنے چنے مصرعوں کے ذریعے وہ بڑی سے بڑی بات بغیر کسی بندش کے کہہ پانے میں کامیاب ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

"اختر صاحب کو اس بات کی مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کا تخلیقی اور اجتہادی ذہن فارم کا پابند ہو کے حشو نویسی پر مجبور نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے ایک ایسا مختصر نظموں کا فارم اختیار کر لیا جس میں وہ اپنی بات زیادہ خوبی سے اور زیادہ فن کارانہ انداز میں کہہ سکتے ہیں۔"[6]

حوالہ۔

1۔آج کل نئی دہلی ستمبر 2020 ص۔18

2۔نیا دور لکھنؤ ستمبر 1998 مضمون اختر بستوی از غلام رضوی گردش۔ص۔22

3۔سیکولرزم اور اردو شاعری از ڈاکٹر اختر بستوی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1996 ص۔153-154

4۔پیکر خیال از اختر بستوی ایم اے مکتبہ دین وادب لاٹوش روڈ لکھنؤ 1970 ص 89۔

5۔بھرتری ہری کے دوہوں کے تراجم کے لئے میں نے پروفیسر عبدالستار دلوی کی معروف تحقیقی کتاب اقبال کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر بھرتری ہری سے استفادہ کیا ہے۔یہ کتاب دائرۃ الادب باندرہ ممبئی سے 2004 میں شائع ہوئی تھی۔

6۔اپنے سائے کے سوا از ڈاکٹر اختر بستوی آفسیٹ پریس گورکھپور 1989۔ص 12

❑❑❑

مفتی محمد خبیر ندوی علیگ

سیتا پور

9936993169

اودھ کی گمنام شاعرہ بسم اللہ بیگم ناز

ضلع سیتا پور اپنی گوناگوں صفات، خصوصیات، اور امتیازات کے سبب پورے برصغیر میں ایک خاص انفرادیت اور ایک غیر معمولی شناخت کا حامل ضلع ہے، جس کی دیگر وجوہات کے سوا ایک سب سے بڑی وجہ اہل سیتا پور کی علمی، دینی، دعوتی، فکری، تحریکی، سیاسی، سماجی، صحافتی، ادبی، شعر و شاعری اور تحریک آزادی سمیت سبھی میدانوں میں انجام پانے اور امتیازی شان وشوکت رکھنے والی وہ نمایاں خدمات ہیں جو خود بخود اپنے آپ میں اس ضلع کو دیگر اضلاع اور مقامات سے ممتاز کرتی ہیں۔

یہاں کے سیاسی اور تحریک آزادی کے انقلابی قائدین (علامہ فضل حق خیر آبادیؒ) ہوں یا یہاں کے سیاست داں (گنگا سروپ بھٹناگر، عابد علی، مختار انیس رضوی، بابو کنہیا لال مہیندر، عمار رضوی وغیرہ)، راہ حق سے بھٹکے اور بگڑے ہوئے سینکڑوں افراد کو اللہ تعالیٰ سے ملا کر ان کے قلوب کو مزکی اور مصفی کرنے والے اولیائے کرام اور صلحائے عظام (حضرت بڑے مخدوم، حضرت چھوٹے مخدوم، حضرت مجا شاہ قلندر، حضرت شاہ برہان الدین، صوفی مولوی محمد اسماعیل نقشبندی" بڑے مولوی صاحب" مولانا احمد علی شاہ" پارے والے مولوی صاحب") ہوں، علم و ادب کی بے لوث خدمت انجام دینے والے ادباء (عبد الحق خیر آبادی، قاضی الیاس جعفری، رئیس احمد جعفری ندوی، پدم شری قاضی عبد الستار، الیاس سیتا پوری، مفتی نجم الحسن خیر آبادی، پروفیسر احسن رضوی) اور شعراء (ریاض خیر آبادی، زائر سیتا پوری، طالب سیتا پوری، نامی سیتا پوری، وصی سیتا پوری، والی سیتا پوری، عادل سیتا پوری، نادم سیتا پوری، جگر بسوانی خُورشید افسر بسوانی) ہوں یا پردہ میں رہ کر علم کی شمع روشن کرنے والی خواتین (نیر صاحبہ، حرماں، زہرا، سیّدہ، صنوبر، مشتری، (سبھی خیر آبادی) بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ ملانی اماں تمبوری، افسری بیگم بسوانی بنت محمد خان نائب تحصیلدار محمود آباد اودھ) ہوں، ہر با کمال فرد فرید نے سیتا پور کی الگ اور خصوصی پہچان قائم کرنے میں مرکزی کردار کیا ہے، اسی لیے جب کوئی مؤرخ کسی بھی زاویے سے تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کرتا ہے تو اسے سیتا پور کا نام نمایاں طور سے جلی حروف میں سورج کی طرح روشن نظر آتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ضلع کے تاریخ ساز قصبہ لہر پور میں قلندریہ بزرگ حضرت مجا شاہ قلندرؒ کے زمانہ 1658 عیسوی سے ہی محفل سماع کے عنوان سے ادبی محافل کا اہتمام ہوتا تھا جس میں دور دراز کے علاقوں سے قوال حضرات شریکِ محفل ہو کر سوئے اور بجھے ہوئے دلوں کو اپنی ترنم ریز آواز سے گرما کر ان کے قلوب میں معرفتِ ربانی کا نیا ساز وگداز چھیڑ کر ادبی خدمات انجام دیتے تھے۔ اسی طرح عاشورہ محرم الحرام کی مناسبت سے عزاداری کے عنوان سے منعقد ہونے والی تعزیتی مجالس نے بھی ادبی تحریک کو پروان چڑھانے میں فعال کردار ادا کیا ہے جس میں مرثیہ گوئی اور نوحہ خوانی کے ذریعے بچے بچے کی زبان پر منظوم کلام اب تک اثر انداز ہے، اور اس زمانے کے بہت سے افراد جو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں یا اگر زندہ بھی ہیں تو وہ بہت زیادہ ضعیف ہو کر سماعت سے معذور ہو چکے ہیں جنہیں اپنے حال کی ہی خبر نہیں ھے ایسے سبھی افراد کو اس زمانے کے مرثیے اور نوحے اب تک زبان زد اور یاد ہیں، خود مجھے اپنی والدہ مرحومہ افسری بیگم متوفیہ 2002 عیسوی کی زبان سے سنا ہوا نوحہ اب تک یاد ہے:

> ''شادی خانہ آبادی تعلیم کی تکمیل کے بعد بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ اپنی عمر کے اٹھارہ سال پورے کر کے سن بلوغ کو پہونچ چکی تھیں تو اب عیسیٰ نگر کے فرمانروا جناب راجہ پڑتاپ بہادر سنگھ کو آپ کی شادی کی بابت فکر لاحق ہوئی کہ آپ کی شایانِ شان کوئی قاعدہ کا لڑکا ملے جس سے آپ کی شادی خانہ آبادی جیسے امور کی انجام دہی ہوسکے، خوش قسمتی سے کٹیسر کے قریب واقع ملانپور چندرہ کا رہنے والا حیدر علی نام کا ایک خوبرو نوجوان لڑکا جو اس وقت عیسیٰ نگر ضلع کھیری لکھیم پور کے موضع مصر گاؤں میں ضلعدار کے عہدے پر مامور تھا، راجہ کی نظر انتخاب اسی سرکاری ملازم ضلعدار کے عہدے پر فائز حیدر علی نامی لڑکے پر پڑی، چونکہ ہونے والے داماد کو راجہ کے داماد ہونے کا فخر و اعزاز حاصل ہو رہا تھا اس لیے رشتہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، جب رشتہ کی بابت حیدر علی کو علم ہوا کہ وہ درویش صفت اور انصاف پسند راجہ پڑتاپ بہادر سنگھ جس کے فہم و فراست، رعایا پروری اور انسانیت نوازی کا ڈنکا بج رہا تھا جیسے نامور خاندان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے۔''

حسن حسین دونوں بھائی
وہ تو لڑنے چلے ہیں لڑائی
ان کی اماں منع کر رہی ہیں
بیٹے لڑنے نہ جیو لڑائی

نیز مرحوم امیر مینائی کے شاگرد رشید اور ضلع سیتاپور کی دنیائے شعر و سخن کے بابا آدم محترم افتخار الحسن صدیقی *جگر بسوا٘* رحمہ اللہ کی 1940 عیسوی میں قائم کردہ ادبی تنظیم *بزم جگر* کے زیر اہتمام شعری و نثری نشستیں ہوں جس میں اس وقت کے شرکاء میں اقبال سہیل، دل شاہجہاں پوری، شاعر لکھنوی، اثیم خیر آبادی اور نواب جعفر علی خان اثر جیسے نامور شعرائے کرام کے نام قابل ذکر ہیں یہ سب شعراء حضرات شریکِ *بزم جگر* ہو کر ان ادبی محافل میں ایک نئی جان سی پیدا کرتے تھے، یا 1952 عیسوی میں راجہ محمود آباد کے زیر انتظام کنور سورج نرائن ادب سیتاپوری کی کوٹھی میں بزم شعر و سخن کا پابندی سے انعقاد اور نبی نگر (لہرپور) میں سیاسی رہنما نیتی پرکاش شکلا کی دیکھ ریکھ میں 1974 عیسوی میں قائم ہونے والی"مجلس شعر و ادب" جس میں جناب اصحاب دیوان جیسے اساتذہ شعرائے کرام مستقل طور سے شریک ہو کر ان ادبی محفلوں کو کامیاب بنانے اور شعر و ادب کو پروان چڑھانے میں میں نمایاں کردار ادا کیا، ان سب کے علاوہ یہاں کے خیرآباد، بسواں اور باڑی وہ قصبات ہیں جن کی ادبی و شعری خدمات اظہر من الشمس ہیں۔

اسی ضلع کے قصبہ بسواں کے ممتاز شاعر محترم افتخار الحسن صدیقی جگر بسوانی (مرحوم امیر مینائی کے چہیتے شاگرد) کی بات کریں تو مرحوم جگر بسوانی نے اپنی پوری زندگی شعر و شاعری کی نذر کرتے ہوئے ایسے مایہ ناز شاگرد تیار کیے جس پر خود ان کو ناز تھا کیونکہ ان کے شاگردوں (خصوصاً سید خورشید افسر بسوانی مرحوم وغیرہ) کی ایک کثیر تعداد ہندو پاک کی یونیورسٹیز میں اعلی عہدوں پر فائز رہ چکی ہے، خود قصبہ تمبور احمد آباد میں مرحوم جگر بسوانی کے شاگردوں کی تعداد تقریباً بیس تک پہونچ جاتی ہے۔

مرحوم جگر بسوانی کے انہیں شاگردوں میں ایک ممتاز خاتون شاعرہ محترمہ بسم اللہ بیگم صاحبہ ناز تمبوری ملانی اماں بھی تھیں، جو سیتاپور کے قریبی قصبہ دھورہرہ ضلع کھیری لکھیم پور (صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ، اب یو پی) کی رہنے والی خاتون شاعرہ تھیں۔ پیدائش محترمہ بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ" ملانی اماں" اسی قصبہ دھورہرہ ضلع کھیری لکھیم پور کے معزز اور شریف خاندان میں 07/ جون 1891 عیسوی کو پیدا ہوئیں، (حاشیہ: واضح رہے کہ ناز صاحبہ کی تاریخ پیدائش بزم سخن کے سرپرست اور استاذ شاعر محترم جناب حضرت مولانا الحاج محمد سمیع الدین سمیع قاسمی صاحب رحمہ اللہ [جو محترمہ ناز تمبوری صاحبہ کے خصوصی شاگرد تھے] نے 17/ جون 2006 کو دوران گفتگو اپنی متوفیہ بیوی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ آج ہی کی تاریخ میں میری بیوی کا درد شکم ہونے کے سبب لہرپور میں انتقال ہوگیا تھا اور غربت کی وجہ سے نعش بھی گھر نہ لاسکا، مجبوراً لہرپور کے قبرستان کربلا میں ہی دفن کرنا پڑا تھا۔

آج ہی سے دس دن قبل 7/ جون کو ہمارے ادبی ذوق کو جلا بخشنے اور مجھے شعر و شاعری کی دولت سے مالا مال کرنے والی ہماری استانی بسم اللہ ناز صاحبہ" ملانی اماں* کا ایک سو پندرھواں یوم پیدائش ہے، اسلئے یہ تاریخ پیدائش متعین کی گئی ھے، م ر خ) آپ کے والد محترم کا نام گلاب خان تھا، مرحوم گلاب خان صاحب کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، البتہ آپ کے تین بیٹیاں تھیں، پہلی اور بڑی بیٹی کا نام امۃ اللہ بیگم، منجھلی بیٹی کا نام عبیدۃ اللہ بیگم اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام بسم اللہ بیگم تھا، مرحوم گلاب خان کی یہی سب سے چھوٹی بسم اللہ بیگم نامی بیٹی بڑی ہو کر راہ سلوک و معرفت میں" ملانی اماں" تو دنیائے علم و ادب اور شعر و سخن کی محفلوں میں پہلے"بسمل" پھر" ناز" صاحبہ کے نام سے مشہور ہوئیں، تعلیم و تربیت بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ کی بڑی بہن امۃ اللہ بیگم کی شادی علاقے کے با اثر، اقرباء پرور، اور علم دوست نامور خاندان کے چشم و چراغ جناب دلدار حسین خان صاحب سے ہوئی تھی، جو ریاست عیسیٰ نگر کے انسانی قدروں کے پاسبان، صوفی منش، درویش صفت انسان، انصاف پسند، غریبوں کے مسیحا، محکوموں کے دکھ درد میں شریکِ وساجھی، نہایت خلیق با مروت، اور اپنی رعایا کے سچے خدمت گار محترم جناب راجہ پرتاپ بہادر سنگھ کے دربار عالیہ میں میر منشی (چیف سکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے۔

بسم اللہ صاحبہ کے انہی بڑے بہنوئی موصوف نے بسم اللہ صاحبہ کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ مرکوز کرتے ہوئے ابتدائی دینی تعلیم کا خصوصی اور بہت عمدہ انتظام کیا، کہ 1898 عیسوی میں تقریب بسم اللہ منعقد کر کے تعلیم کا باقاعدہ آغاز کرا دیا، اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ کی طبیعت میں علم کی محبت فطری طور پر ودیعت کر رکھی تھی اس لیے آپ نے بہت جلد علوم دینیہ خصوصاً قرآن کریم، اردو، ہندی اور ریاضی کی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ 1904 عیسوی میں درجہ پنجم کی تعلیم بھی پوری کرلی۔

پرائمری تعلیم کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لیے جب آپ نے اپنے بڑے بہنوئی سے اپنی تعلیمی خواہش کا اظہار کیا تو آپ کے بڑے بہنوئی نے آپ کے علمی ذوق و شوق اور جذبہ حصولِ علم کی قدر کرتے ہوئے مزید تعلیم کے لیے آپ کو اپنے ساتھ لے کر ریاست کے صدر مقام عیسیٰ نگر لے آئے، ریاست عیسیٰ نگر کے انسانی قدروں کے نگہبان، درویش صفت اور انصاف پسند راجہ پڑتاپ بہادر سنگھ جو خود بھی لاولد تھے اور ایک مدت سے کسی بچے کو اپنا منھ بولا بیٹا بیٹی بنانے کے خواہش مند بھی تھے۔

جب اپنے دربار عالیہ کے میر منشی (چیف سکریٹری) کی معرفت بسم اللہ بیگم صاحبہ سے متعارف ہوئے تو انہی کو اپنی اولاد مان کر تعلیم و تربیت کے ماہرین اور قابل قدر اساتذہ کرام کے توسط سے آپ کو زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا اپنا مقصد زندگی بنالیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ نے 1906 عیسوی میں مڈل (جونیئر ہائی اسکول جس کو پاس کرنا سرکاری ملازمت کے لئے ضروری تھا) اور 1908 عیسوی میں اس وقت کی اعلی تعلیم ہائی اسکول (دسویں کلاس) میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئیں، اور ریاست بھر میں کامیاب ہونے والوں میں اول مقام حاصل کیا، جس پر ریاست کے راجہ جناب پڑتاپ بہادر سنگھ نے اپنی محنت کا ثمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر غیر معمولی طور پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی منھ بولی صاحبزادی بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ کو خصوصی انعام سے نوازا، [نکتہ] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت آزادی سے قبل اور بہت دنوں تک آزادی کے بعد بھی معاشرے میں عمومی اور مسلم معاشرے میں خصوصی طور پر عورتوں کی تعلیم معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اس دور میں جو گھرانے تعلیم یافتہ کہلاتے تھے وہ بھی اپنی وسعت ظرفی اور کشادہ دلی کا خصوصی مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں کو صرف اور صرف پڑھانے پر ہی اکتفاء کرتے تھے، عورتوں کو لکھنے لکھانے کی تعلیم مکروہ تحریمی کے درجہ میں گناہ کبیرہ تصور کی جاتی تھی، اور اس زمانے میں مہذب اور شریف گھرانوں میں بھی عورتوں کو صرف دینیات خصوصاً قرآن کریم کی تعلیم کا نظم و نسق ہوتا تھا لکھائی سے کوسوں دوری تھی، اس بارے میں خود میں نے اپنی والدہ محترمہ افسری بیگم مرحومہ (بنت محمد خان مرحوم ضلعدار ریاست بلہرہ جو خود تعلیم یافتہ اور

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہر وقت کوشاں رہتی تھیں) سے متعدد بار سنا کہ ہمارے بڑے بوڑھوں کے بقول ”لڑکیوں کو لکھنا سکھانے سے وہ خراب ہو جاتی ہیں“، ایسے نازک دور میں بسم اللہ ناز صاحبہ کی تعلیم کا اہتمام کس قدر مشکل ترین مرحلہ ہوا ہوگا جس میں بہت ہی حکمت عملی اور دانشوری سے کام لیا گیا ہوگا۔

شادی خانہ آبادی تعلیم کی تکمیل کے بعد بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ اپنی عمر کے اٹھارہ سال پورے کر کے سن بلوغ کو پہونچ چکی تھیں تو اب عیسیٰ نگر کے فرمانروا جناب راجہ پڑتاپ بہادر سنگھ کو آپ کی شادی کی بابت فکر لاحق ہوئی کہ آپ کی شایانِ شان کوئی قاعدہ کا لڑکا ملے جس سے آپ کی شادی خانہ آبادی جیسے امور کی انجام دہی ہو سکے، خوش قسمتی سے کٹیسر کے قریب واقع ملاپور چندرہ کا رہنے والا حیدر علی نام کا ایک خوبرو نوجوان لڑکا جو اس وقت عیسیٰ نگر ضلع کھیری لکھیم پور کے موضع مصر گاؤں میں ضلعدار کے عہدے پر مامور تھا، راجہ کی نظر انتخاب اسی سرکاری ملازم ضلعدار کے عہدے پر فائز حیدر علی نامی لڑکے پر پڑی، چونکہ ہونے والے داماد کو راجہ کے داماد ہونے کا فخر و اعزاز حاصل ہو رہا تھا اس لیے رشتہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، جب رشتہ کی بابت حیدر علی کو علم ہوا کہ وہ درویش صفت اور انصاف پسند راجہ پڑتاپ بہادر سنگھ جس کے فہم و فراست، رعایا پروری اور انسانیت نوازی کا ڈنکا بج رہا تھا جیسے نامور خاندان سے رشتہِ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے اور جس خاتون سے اس کی شادی کا فیصلہ کیا گیا ہے وہ کوئی عام خاتون نہیں ہے، بلکہ راج گھرانے کے شاہانہ ناز و نعم میں پلنے بڑھنے والی اس خاتون سے ہو رہی ہے جو ریاست بھر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین میں فرسٹ مقام حاصل کرنے والی ایک باکمال، منفرد اور ممتاز خاتون ہے، اس احساس و خیال نے حیدر علی کے ذہن و دماغ میں انقلاب برپا کر دیا اور سرکاری نوکری سے دل برداشتہ ہو گئے، اسی وقت سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنے گھر آ کر اپنا بستر بوریا باندھا اور علوم اسلامیہ دینیہ کے حصول کے لیے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لے لیا، مراحل داخلہ طے کرنے کے بعد جب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور انتظامیہ کو آپ کی بابت علم ہوا کہ یہ نو وارد طالب علم اپنے علاقے کا ضلع دار کے عہدے پر فائز رہ چکا ہے اور عشقِ خداوندی کے جذبہ سے سرشار ہو کر علوم اسلامیہ دینیہ کے حصول کے لیے کوشاں ہے تو پھر یہاں کے اساتذہ کرام نے بھی آپ پر اپنی بھرپور توجہ مبذول کی، جس کا ثمرہ سب کے سامنے عیاں ہوا کہ آپ کے مخلصانہ جذبات اور اساتذہ کرام کی خصوصی توجہات نے سونے پے سہاگہ کا کام کیا، اب آپ دینی و دنیوی تعلیم کا سنگم اور اپنے اساتذہ کرام کی آنکھوں کا نور اور ان کے دلوں کا سرور بن چکے تھے۔

ادھر راجہ کی نگاہوں میں آپ پہلے سے ہی بسے ہوئے تھے، علوم اسلامیہ دینیہ کے حصول نے مزید رغبت پیدا کر دی، جب فارغ ہو کر اپنے وطن واپس لوٹے تو راجہ نے اپنی منھ بولی بیٹی بسم اللہ بیگم ناز صاحبہ کا عقد نکاح آپ کے ساتھ کرتے ہوئے آپ کی تقریب شادی خانہ آبادی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کی، اور آپ عیسیٰ نگر لکھیم پور سے بیاہ کر اپنی سسرال کٹیسر کے قریب واقع ملاپور چندرہ سیتاپور تشریف لے آئیں، سابق ضلعدار مسٹر حیدر علی صاحب اب مسٹر سے جناب مولانا حیدر علی ہو چکے تھے، شادی کے بعد جناب مولانا حیدر علی کا تقرر مدرسہ رکنیہ لہرپور میں ہو گیا اور آپ یہاں تعلیم و تعلم میں مصروف ہو گئے۔

❑❑❑

غزل

کسی کی رات کو روشن بنا بھی سکتے ہیں
دیئے مکان کسی کا جلا بھی سکتے ہیں

ابھی خرید سکو تو خرید لو ہم کو
ہم اپنا دام کسی دن بڑھا بھی سکتے ہیں

ہیں منتظر کہ وہ اک شخص پوچھنے آئے
ہم اپنی وجہِ تباہی بتا بھی سکتے ہیں

تمہیں پکار کے دیکھا ہے تم نہیں آئے
ہمیں پکار کے دیکھو ہم آ بھی سکتے ہیں

جو ہنس رہے ہیں وہ خوش بھی ہوں کیا ضروری ہے
لبوں پہ جھوٹی ہنسی وہ سجا بھی سکتے ہیں

تنگ آ چکے ہیں لگاتار خشت باری سے
یہ آئنے کبھی پتھر چلا بھی سکتے ہیں

خموش بیٹھے ہیں مردہ نہیں ہوئے ہیں ابھی
پرندے پنکھ کبھی پھڑپھڑا بھی سکتے ہیں

احمد کمال حشمی
کانکی نارہ، مغربی بنگال
9433145485

گلشن آرا
قاضی نذرل یونیورسٹی، چاند نگر، کولکاتہ
8910509877

جدید لہجے کا منفرد شاعر: عرفان ستار

عرفان ستار ۱۸ فروری ۱۹۶۸ءکو کراچی (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کی رہائش لیبیا میں رہی جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں کراچی آکر انہوں نے ایم بی اے اور ایم ایس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ ایک ادویات بنانے والی کمپنی کے اہم انتظامی عہدے پر فائز رہے۔ عرفان ستار نے ۱۹۹۰ء میں شاعری کا آغاز کیا اور پاکستان میں قیام کے دوران ہی ان کی شاعری مقبولیت کے تدریجی مراحل طے کرنے لگی اور اپنے گردوپیش کے ماحول کو اپنے حلقۂ شہرت میں لے لیا۔ ۲۰۱۰ء کے بعد وہ کینیڈا میں مقیم ہیں اور اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ عرفان ستار بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور بہت پہلے سے ہی ان کی شاعری ہندو پاک کے مختلف ادبی جریدوں میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں، جس کی وجہ سے ان کے قارئین کا ایک حلقہ بہت جلد تیار ہوگیا۔ ہندوستان میں ان کی شاعری اس وقت خاصی مقبول ہوئی جب ''شب خون'' کے ایک شمارے میں ایک ساتھ ان کی تیس غزلیں شائع ہوئیں۔ ان کے دو شعری مجموعے، تکرارِ ساعت اور ساعت امکاں، منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

عرفان ستار کے اسلوبِ کلام میں جدیدیت اور روایتی حسنِ بیان دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری کے ابتدائی مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ''زبان کے شاعر'' ہیں یعنی اپنی تخلیق میں الفاظ کی نشست و برخواست پر گہری توجہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں مختصر اور طویل دونوں بحروں میں غزلیں ملتی ہیں اور ان کے غزلوں میں استعمال ہونے والی طویل بحریں بھی ان کی فنی پختگی کے اعلامیہ کے ساتھ ان کا مخصوص شعری رویہ ہے۔ ان کی غزلوں کی طوالت کے باوجود بہت کم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھرتی کے اشعار آگئے ہوں اور جبراً کوئی شعر بڑھایا گیا ہو۔ عرفان ستار اپنی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک مضمون کے نیا یا پرانا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس مضمون کا بیان کتنے شاعرانہ انداز سے ہوا ہے، یہ بات اس شعر کے اچھا یا برا ہونے اور اس سے بھی قبل اُس کے شعر ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرتی ہے۔''

(تکرارِ ساعت، ص 10)

یہ نقطہ ان کے تخلیقی شعور کی اہم بنیاد ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیال کے حسن سے زیادہ اس کے جمالیاتی اظہار کے قائل ہیں اور یہ ان کی شاعری میں جابجا نظر بھی آتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''میری شاعری میرے ہونے کے جواز کی تلاش مسلسل کے دوران میرے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ میری شاعری میں موجود کوئی بھی کیفیت شاید نئی نہ ہو، اس لیے کہ اس کائنات میں کچھ بھی نیا نہیں۔''

(تکرارِ ساعت۔ ص 11)

عرفان ستار کے مذکورہ بیان سے ان کے شعری رویے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اپنے اسی شعری رویے کی وجہ سے وہ موضوعات کی تکرار سے گھبراتے نہیں بلکہ اپنے تخلیقی تجربے اور انفرادی طرزِ احساس سے ان موضوعات میں جدت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی یہ فکری اساس اردو غزل میں جدید شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیں:

> ''عرفان ستار کے یہ اشعار خیال اور احساس کی جدت کا عمدہ نمونہ ہیں جہاں روایتی محبت کے انداز کو جدید نفسیاتی زاویے سے برتا گیا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر محبوب کی ذات سے زیادہ اپنی توجہ کے انداز اور نظر کی قوت پر سوال اٹھاتا ہے گویا توجہ کا مرکز محبوب نہیں بلکہ اس کی برداشت کی حد ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی جدائی کے بعد بھی نظر کا اسی سمت جمی رہنا ایک نفسیاتی عادت بن چکی ہے جو عاشق کی داخلی الجھن کی عکاسی کرتی ہے۔ تیسرے شعر میں خود سے باہر نکل کر اپنی وحشت کا مشاہدہ کرنے کی خواہش جدید انسان کے وجودی بحران اور خود احتسابی کا اشارہ ہے۔ آخری شعر میں شاعر رشتوں کی معنویت پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ محض کسی کی موجودگی صورت کا اضافہ تو ہے مگر اس کی کمی اب بھی باقی ہے۔ عرفان ستار کی شاعری میں خیال اور احساس کی جدت کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ محض جذبات کے شاعر نہیں بلکہ شعور اور تخلیقی ذہانت سے اپنے احساس کو گہرائی عطا کرتے ہیں۔''

یہاں تکرار ساعت کے سوا کیا رہ گیا ہے
مسلسل ایک حالت کے سوا کیا رہ گیا ہے

عرفان ستار کی شاعری میں علامت کا استعمال بھی ملتا ہے لیکن وہ ان کی شاعری کو گنجلک اور نا قابل فہم نہیں بناتے بلکہ ان سے نیا اور انوکھا احساس اور اور معنیٰ بھی پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں 'آگ' اور 'لو' سے ایک نیا احساس پیدا کیا ہے:

تو اپنی آگ مری لو سے متصل کر دے
میں ایک شب کے لیے جگمگانا چاہتا ہوں

عرفان ستار اردو غزل کی جدید روایت میں ایک ایسی آواز ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی ذہانت، فکری گہرائی اور شاعرانہ بصیرت سے غزل کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کی شاعری جدید لفظیات، موضوعاتی تنوع اور محسوساتی نظام کی تاثیر کے امتزاج سے اپنی انفرادیت قائم کرتی ہے۔ ان کا فن نہ صرف روایتی غزل کے صنفی وفنی لوازم کا اہتمام کرتا ہے بلکہ جدید انسان کے وجودی اضطراب، سماجی شعور اور روحانی جستجو کو بھی اپنے اندر سموتا ہے۔

عرفان ستار نے اپنی شاعری کی لفظیات ان کی اپنی ہیں جو نہ صرف جمالیاتی سطح پر اثر انگیز ہیں بلکہ جن میں فکری و معنوی گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کا لفظوں کا انتخاب اور اس کا شعری سیاق میں برتاؤ ایک ایسی تخلیقی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے جو روایتی لسانی ذخیرے کو جدید حساسیت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ان کے شاعری میں لفظ محض ایک صوتی یا علامتی اکائی نہیں بلکہ ترسیل کا ایک ایسا وسیلہ ہے جو خیال، احساس اور تصور کو ایک وحدت میں ڈھالتا ہے۔ خواجہ رضی حیدر لکھتے ہیں:

> ''عرفان ستار کا مصرعہ لکھنے کا طور عامیانہ نہیں، خلاقانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں لفظ مقصود بالذات نہیں بلکہ معنویت اور متخیلہ ایک بلیغ ترسیل کا وسیلہ ہیں۔''

(تکرار ساعت، ص 20)

یہ اشعار بھی ملاحظہ کریں:

سنا رہے ہو ہمیں کس نگاہ ناز کے غم
ہم اُس کے سامنے ہوتے تو پوچھتی بھی نہیں

ہر گزرتے ہوئے لمحے میں تپکتا ہوا میں
درد ہوں، وقت کے اعصاب میں آیا ہوا میں

اس شعر میں ''نگاہ ناز'' کی ترکیب روایتی شاعری سے مستعار ہے لیکن اگر پورے شعر کے احساس پر غور کریں تو اس شعر کی خوبصورتی ''نگاہ ناز'' میں نہیں بلکہ مکمل شعر ایک خیال کو پیش کر رہا ہے۔ ان کی شاعری میں روایتی تراکیب کا استعمال عام طور پر ایک جدید نفسیاتی سیاق میں ہوتا ہے۔ ان کی لفظیات محبت کی نارسائی اور خود سے مکالمے کی کیفیت کو نہ صرف گرفت میں لیتی ہیں بلکہ قاری کو ایک ایسی ذہنی فضا میں لے جاتی ہیں جہاں جذبات کی شدت اور فکری اضطراب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے میں تپکتا ہوا میں
درد ہوں، وقت کے اعصاب میں آیا ہوا میں

اسی طرح دوسرے شعر میں 'وقت کے اعصاب' کے استعمال پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ 'تپکنا' اور 'وقت کے اعصاب' سے کوئی معنوی گہرائی پیدا کرنا یا کوئی لفظی شعبدہ گری دکھانا شاعر کو مقصود نہیں ہے لیکن پورے شعر سے جو احساس پیدا ہوتا ہے وہی شعر کی خوبصورتی ہے۔ عرفان ستار کی لفظیات کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کے استعارات اور تلازموں کی قلب ماہیت ہے۔ وہ روایتی استعارات کو نئی معنوی جہتوں سے آشنا کرتے ہیں۔

یہاں تکرار ساعت کے سوا کیا رہ گیا ہے
مسلسل ایک حالت کے سوا کیا رہ گیا ہے

یہ شعر گواہی دیتا ہے کہ کس طرح وہ ایک سادہ ترکیب کو وجودی بے زاری اور یکسانیت کے فلسفیانہ بیان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں الفاظ کا آہنگ، بحر کی روانی اور لسانی تراکیب کی تازگی ایک ایسی شاعرانہ بے ساختگی پیدا کرتی ہے جو قاری کو فکری و جذباتی طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

محبت کی لاحاصلی ان کی شاعری کا ایک موضوع ہے مگر وہ اسے محض ایک رومانوی کیفیت تک محدود نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں لاحاصلی ایک عالمگیر انسانی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے جس میں الم انگیزی کے ساتھ نشاط کا ایک پیوند لگا ہوا ہے:

عجیب ہے یہ مری لاتعلقی جیسے
جو کر رہا ہوں بسر میری زندگی ہی نہ ہو

یہ شعر محبت کی نارسائی کو وجود کی تنہائی اور خود سے بیگانگی کے ایک وسیع تر تناظر میں پیش کرتا ہے۔ عرفان ستار اس موضوع کو ایک ایسی شاعرانہ گہرائی سے برتتے ہیں کہ یہ قاری کے لیے ایک ذاتی تجربے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔

ترا ہونا تو ہے بس ایک صورت کا اضافہ
ترے ہونے سے کیا تیری کمی کم ہوگئی ہے

یہ شعر دائمی تشنگی کی ایک ایسی تصویر کشی کرتا ہے جو جدید انسان کے فطرت کی عکاس ہے۔ عرفان ستار کے موضوعات میں یہ صلاحیت کہ وہ روایتی غزل کے موضوعات کو بھی جیسے عشق، ہجر اور وصال کو جدید فلسفیانہ اور نفسیاتی تناظر میں ایک جدید احساس کے ساتھ پیش کریں۔ یہ تخلیقی ذہانت ان کی شاعری کو ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوعاتی تنوع نہ صرف ان کی فکری وسعت کی دلیل ہے بلکہ ان کی تخلیقی ذہانت کا مظہر بھی ہے۔

عرفان ستار کی شاعری کا محسوساتی نظام ان کے فن کی جان ہے۔ ان کا محسوساتی نظام اندرونی اضطراب اور وحشت کو نہ صرف گرفت میں لیتا ہے بلکہ اسے ایک تخلیقی تجربے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ ان کا ایک شعر:

کبھی تو چند لمحے خود سے بھی باہر بسر کر لوں
ذرا دیکھوں تو وحشت کی فراوانی کہاں تک ہے

مآل عشق انا گیر ہے یہ مختصراً
میں وہ درندہ ہوں جو خود کو ہی چبا گیا ہوں

پہلا شعر ان کی اس صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تنہائی اور اضطراب کو ایک ایسی شاعرانہ فضا میں پیش کرتے ہیں جہاں یہ کیفیات قاری کے لیے ایک عالمگیر تجربے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ چند لمحے خود سے باہر بسر کرنے کی خواہش جدید انسان کی مجبوری ہے تاکہ وہ یکسانیت اور مشینی زندگی سے کچھ نجات حاصل کر سکے لیکن جب یہ لمحہ بھی وحشت کی فراوانی کا لمحہ بن جائے تو یہ ایک ایسی کیفیت کا آفریدہ ہوتا ہے جہاں وحشت ہی وحشت ہوتی ہے۔ ان کے محسوساتی نظام کی ایک اور نمایاں خصوصیت جدید انسان کے وجودی

مسائل سے گہری وابستگی ہے۔ وہ رسائی اور نارسائی کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کو اپنے شعر میں گرفت کرتے ہیں۔

میرے سوا بھی کوئی گرفتار مجھ میں ہے
یا پھر مرا وجود ہی بیزار مجھ میں ہے
جہاں کا ہوں وہیں کی راس آئے گی فضا مجھ کو
یہ دنیا بھی بھلا کوئی جگہ ہے میرے رہنے کی

یہ اشعار خود سے بیگانگی اور وجودی اضطراب کی ایک ایسی تصویر کشی کرتا ہے جو جدید انسان کے اندرونی تنازعات کی عکاس کرتے ہیں۔ عرفان ستار کا محسوساتی نظام نہ صرف جذباتی بلکہ فکری طور پر بھی اثر انگیز ہے۔ ان کے شعر میں انسانی تجربات کی ایسی فضا تخلیق ہوتی ہے جہاں شاعر اور قاری کا تجربہ ایک دوسرے میں مل جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں لاحاصلی، وحشت اور نارسائی جیسے موضوعات کو جس طرح نشاط اور تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ ان کی منفرد اسلوبیاتی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ خواجہ رضی حیدر رقم طراز ہیں:

''اظہار میں جدید ہونا اور احساس میں جدید ہونا دو مختلف حالتیں ہیں لیکن عرفان ستار اپنی تخلیقی ذہانت کی بنا پر اظہار میں بھی جدید ہیں اور احساس میں بھی۔''

(تکرار ساعت ص 24)

خیال اور احساس کی یہ جدت ان کی شاعری میں جا بجا نظر بھی آتی ہے۔

ہمارے طرزِ توجہ پر خوش گمان نہ ہو
تجھے نہیں تری تاب نظر کو دیکھتے ہیں
وہ جس طرف ہو نظر اس طرف نہیں اٹھتی
وہ جا چکے تو مسلسل ادھر کو دیکھتے ہیں
کبھی تو چند لمحے خود سے بھی باہر بسر کر لوں
ذرا دیکھوں تو وحشت کی فراوانی کہاں تک ہے
ترا ہونا تو ہے بس ایک صورت کا اضافہ
ترے ہونے سے کیا تیری کمی کم ہوگئی ہے

عرفان ستار کے یہ اشعار خیال اور احساس کی جدت کا عمدہ نمونہ ہیں جہاں روایتی محبت کے انداز کو جدید نفسیاتی زاویے سے برتا گیا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر محبوب کی ذات سے زیادہ اپنی توجہ کے انداز اور نظر کی قوت پر سوال اٹھاتا ہے گویا توجہ کا مرکز محبوب نہیں بلکہ اس کی برداشت کی حد ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی جدائی کے بعد بھی نظر کا اسی سمت جمی رہنا ایک نفسیاتی عادت بن چکی ہے جو عاشق کی داخلی الجھن کی عکاسی کرتی ہے۔ تیسرے شعر میں خود سے باہر نکل کر اپنی وحشت کا مشاہدہ کرنے کی خواہش جدید انسان کے وجودی بحران اور خود احتسابی کا اشارہ ہے۔ آخری شعر میں شاعر رشتوں کی معنویت پر سوال اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ محض کسی کی موجودگی صورت کا اضافہ تو ہے مگر اس کی کمی اب بھی باقی ہے۔

عرفان ستار کی شاعری میں خیال اور احساس کی جدت کو دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ محض جذبات کے شاعر نہیں بلکہ شعور اور تخلیقی ذہانت سے اپنے احساس کو گہرائی عطا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ محض کیفیت نہیں بلکہ فکری سفر کا آغاز ہے۔ اس تناظر میں احمد جاوید کا کہنا بالکل بجا محسوس ہوتا ہے کہ:

''عرفان ستار بنیادی طور پر شدتِ احساس کے شاعر ہیں۔ احساس کی شدت اگر ذہن کی شمولیت سے عاری ہو تو شعر میں کم از کم دو چیز میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ ایک لفظ کے بیشتر امکانات کو برتنے کا سلیقہ اور دوسرے تخیل۔ عرفان ستار کی غزل میں یہ دونوں چیز میں تمام و کمال موجود ہیں۔''

(تکرار ساعت ص 16)

عرفان ستار نے اداسی، عشق، جنون، وحشت کے موضوعات کو اپنی شاعری میں خوب برتا ہے۔ اداسی پر انہوں نے ایک طویل غزل کہی ہے۔ ان کے کچھ اشعار دیکھیں:

میں مبتلا کبھی ہوتا نہیں اداسی میں
میں وہ ہوں جس میں کہ خود مبتلا اداسی ہے
شدید درد کی رو ہے رواں رگ جاں میں
بلا کا رنج ہے، بے انتہا اداسی ہے
مجھے مسائل کون و مکاں سے کیا مطلب
مرا تو سب سے بڑا مسئلہ اداسی ہے

عرفان ستار کے ان اشعار میں اداسی محض ایک جذباتی کیفیت نہیں بلکہ شاعر کی ذات کا وجودی مسئلہ ہے جہاں وہ خود کو اداسی میں مبتلا نہیں بلکہ اداسی کو اپنی ذات میں محصور پاتا ہے۔ اس فکری اور نفسیاتی شدت کو شاعر نے نہایت سادگی سے بیان کیا ہے اسی طرح شدید درد کی رو اور بلا کا رنج اس کی رگِ جاں میں اس طرح رواں ہے کہ کائنات کے مسائل اس کے سامنے بے معنی ہو جاتے ہیں اور اس کی پوری ہستی کا سب سے بڑا مسئلہ صرف اور صرف اداسی کی گرفت بن جاتی ہے۔

لیکن اس اداسی میں قنوطیت، لا یعنیت اور زندگی سے فرار کا جذبہ نہیں ہے۔ غم واندوہ اور اداسی کے باوجود ان کے یہاں گلہ شکوہ یا بیزاریت نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس کیفیت میں پہنچ جاتے ہیں:

بے حد خوشی ہے اور ہے بے انتہا سکون
اب درد ہے، نہ غم، نہ گلہ ہے، یہ عشق ہے

جدید شاعری میں عشق کا خیال جسم کے ساتھ ہی آتا ہے لیکن عرفان ستار کا عشق جسم سے ماورا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیں:

کیا رمز جانتی ہے تجھے اصل عشق کی
جو تجھ میں اس بدن کے سوا ہے، یہ عشق ہے
زیر قبا جو حسن ہے، وہ حسن ہے خدا
بند قبا جو کھول رہا ہے، یہ عشق ہے
جو عقل سے بدن کو ملی تھی، وہ تھی ہوس
جو روح کو جنوں سے ملا ہے، یہ عشق ہے

عرفان ستار کی شاعری میں عشق صرف جسمانی یا جذباتی تعلق تک محدود نہیں ہے۔ ان کا عشق وہ ہے جو بدن کے سوا انسان کے اندر کسی اور سطح پر پروان چڑھتا ہے۔ زیر قبا جو حسن ہے، وہ حسن ہے خدا، عشق کے اس پوشیدہ حسن کی طرف اشارہ ہے جو ظاہری حسن سے بالاتر ہے اور خدائی جمال کی نمائندگی کرتا ہے۔ عقل سے بدن کو ملنے والی خواہش کو 'ہوس' قرار دے کر شاعر نے عشق کے دو متضاد مراحل کی تمیز کی ہے: ایک جسمانی اور عارضی، دوسرا

روحانی اور دائمی۔عرفان ستار نے عشق کو ایک مکمل تجربہ قرار دیا ہے جو عقل و جسم کی حدوں سے بالاتر ہو کر روح کو جنون کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہی عشق ہے۔

عرفان ستار کی شاعری میں وجود اور عدم، ذات اور حقیقت اور خدا کے تصور کی تلاش بھی نظر آتی ہے۔کچھ اشعار دیکھیں:

یہ خبر ہے، مجھ میں کچھ میرے ہوا موجود ہے
اب تو بس معلوم کرنا ہے کہ کیا موجود ہے
ایک میں ہوں، جس کا ہونا ہو کے بھی ثابت نہیں
ایک وہ ہے، جو نہ ہو کر جا بجا موجود ہے
ہاں خدا ہے، اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں
اس سے تم یہ مت سمجھ لینا خدا موجود ہے
حل کبھی ہوتا نہیں یہ ہست کی اقلیم میں
میں ابھی زندہ ہوں سو یہ مسئلہ موجود ہے

ان اشعار میں عرفان ستار نے نہایت سادہ اور پراثر زبان میں وجود، عدم، خدا اور معرفت کے صوفیانہ سوالات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اپنی ذات اور کائنات کی حقیقت پر غور کرنے پر مجبور کر ہو جاتا ہے۔

عرفان ستار کی شاعری میں فکری گہرائی، معنویت، اسلوب کی انفرادیت تخلیقی ذہانت اور احساس کی شدت نمایاں ہیں جن سے وہ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔انہوں نے اردو غزل کو نئے موضوعات، نئے زاویے اور نئے اسالیب سے نوازا ہے۔عرفان ستار کی شاعری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ان کی شاعری جدید غزل کا اہم حوالہ ہے۔اکیسویں صدی کے غزل گو شعرا کی فہرست میں ان کا نام یقیناً تابندہ رہے گا۔

❑❑❑

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ نیا دور کے وہ قارئین جو اس کے مستقل ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے خواستگار ہیں تو لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے رابطہ کریں۔

دانش محل:
امین آباد لکھنؤ۔9792361533

عرش پبلیکیشنز:
خواجہ ٹاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔9935915110

غزل

کسی سے قرض لیتے ہیں نہ ہم احسان لیتے ہیں
وہی ہم کر گزرتے ہیں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

درندے پہلے آدم خور ہوتے تھے زمانے میں
مگر انسان ہی انسان کی اب جان لیتے ہیں

مقدس سب کتابیں ہیں جو اتری آسمانوں سے
مگر ان میں ہم اپنے واسطے قرآن لیتے ہیں

ابھی ہم مبتدی ہیں شاعری کی ابتداء کی ہے
غزل کہتے ہیں تو ہم میرؔ کا دیوان لیتے ہیں

ایاز با وفا ہو یا کوئی محمود سا سلطاں
غلاموں کا ہمیشہ امتحاں سلطان لیتے ہیں

کرو جب گفتگو تو ریختہ کے پھول ہیں جھڑتے
تمہاری گفتگو سے ہم تمہیں پہچان لیتے ہیں

یہ شہر لکھنؤ ہے میرؔ و سوداؔ کا یہاں والے
غنیمت ہے محیؔ تم کو جو شاعر مان لیتے ہیں

محی بخش قادری
6/48، ونیت کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ
9839018959

غزل

ہم آگہی کا انوکھا عذاب پیتے ہیں
بجائے اشک لہو کی شراب پیتے ہیں

یہ کیسی پیاس ہے بجھتی نہیں کسی صورت
سمندروں کو سنا ہے حباب پیتے ہیں

شراب پینے لگے ہم تو اس میں حیرت کیا
یہاں بڑے بڑے عالی جناب پیتے ہیں

ہماری قدر کرو اے مسافرانِ شب
کہ ہم کھلی ہوئی آنکھوں سے خواب پیتے ہیں

اسی لئے ہے چمن پر نکھار کا عالم
تمہارے جسم کی خوشبو گلاب پیتے ہیں

ہماری آنکھ بھی منظر یہ ایک دن دیکھے
سنا ہے ذرے وہاں آفتاب پیتے ہیں

ہمارے ظرف کا عالم نہ پوچھئے نجمی
خموش رہ کے نمو کا عذاب پیتے ہیں

عرفان نجمی
100/111 کرنیل گنج، کاغذی محال، کانپور
8957550267

غزل

مضبوط اگر عشق کا رشتہ نہیں ہوتا
مجنوں کبھی وارفتۂ لیلا نہیں ہوتا

مشکل میں یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا
''اپنا جسے کہتے ہیں وہ اپنا نہیں ہوتا''

بے چین بہت رہتی ہے اُس وقت طبیعت
جب سامنے اُس کا رُخِ زیبا نہیں ہوتا

ہوتی نہ اگر ہونٹوں پہ حق گوئی کی تلخی
پھر کوئی مرے خون کا پیاسا نہیں ہوتا

سڑکوں پہ وہ بے یار و مددگار نہ پھرتی
ماں تھی تو اُسے گھر سے نکالا نہیں ہوتا

مل جاتی اگر اُس کو بھی تعلیم کی دولت
مجبور وہ مزدوری پہ بچہ نہیں ہوتا

مخمورؔ خودی مائل تقلید ہے اُس کی
جو پیاس میں منت کش دریا نہیں ہوتا

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
68-چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
9450097929

غزل

میں کبھی شکوۂ تقدیر نہیں کر سکتا
زندگی! میں تری تحقیر نہیں کر سکتا

شہر میں اور بھی گل چہرے بہت ہیں لیکن
دل کو میں خانۂ تصویر نہیں کر سکتا

خواب دیکھا ہے مگر خواب کا مطلب کیا ہے
کوئی پوچھے تو میں تعبیر نہیں کر سکتا

ابن سینا ہو کہ سقراط کہ فارابی ہو
ذاتِ حق کی کوئی تفسیر نہیں کر سکتا

حق کی نسبت تو کرے لاکھ فسانہ سازی
پر حقائق کو اساطیر نہیں کر سکتا

مدّعی لاکھ تبرّا کرے میرے فن پر
کم مرے شعر کی تاثیر نہیں کرسکتا

وصل بھی اڑتے پرندے کا ہے سایہ نجمیؔ
اور سائے کو میں زنجیر نہیں کرسکتا

حنیف نجمی
فیصل ولا، نیاپارہ وارڈ دھمتری، چھتیس گڑھ
7869292242

غزل

دکھ اٹھائے ہیں ہم نے خوشی کے لئے
روز مرتے ہیں ہم زندگی کے لئے

نفرتوں کے اندھیرے ہیں چھائے ہوئے
آؤ کوشش کریں روشنی کے لئے

وہ برائی کہ ہے نام جس کا حسد
دل میں رکھتے نہیں ہم کسی کے لئے

آنسوؤں سے نہ لکھ زندگی کی کتاب
کچھ ورق چھوڑ دے تو خوشی کے لئے

روک دو بڑھ کے نفرت کے سیلاب کو
یہ خطرناک ہے ہم سبھی کے لئے

کوئی محروم فضل خدا سے نہیں
رحمتیں اس کی ہیں ہر کسی کے لئے

اب تو یاسینؔ مہنگائی کے دور میں
مشکلیں ہیں غریب آدمی کے لئے

یاسین انصاری
اٹاوہ، یوپی
9690433139

غزل

خون کے رشتے کا حق یوں بھی ادا کرتا ہے
میرا بھائی مرے مرنے کی دعا کرتا ہے

میں ہوں زندہ تو سبب یہ ہے کہ خالق میرا
میرے دشمن کے نشانے کو خطا کرتا ہے

میں نے جس روز سے مانگی ہے حفاظت کی دعا
آندھیوں میں بھی مرا دیپ جلا کرتا ہے

روز کرتا ہے مرے قتل کی سازش کوئی
روز سر دھڑ سے مرا کوئی جدا کرتا ہے

منتظر ہے یہ جہاں حلقۂ نمرودی میں
کون کردار براہیم ادا کرتا ہے

تیری تہذیب سے تہذیب جدا ہے میری
تو تو ہے شیر مرے گاؤں میں کیا کرتا ہے

جب سے اس کو مرے دشمن نے خریدا ہے شفیعؔ
میری باتوں کو وہ چھپ چھپ کے سنا کرتا ہے

ڈاکٹر محمد شفیع سیتاپوری
فاتحی مسجد روڈ، محلہ ہدایت نگر، لکھیم پور، کھیری
9453617899

غزل

حسن و جمال کے سبھی پیکر چلے گئے
نظروں کے سامنے تھے جو منظر چلے گئے

افسوس! ان کو جانے سے روکا نہ جا سکا
بیٹھے تھے بزم میں، اٹھے، اٹھ کر چلے گئے

بستی میں جنکی وجہ سے رونق تھی ہر طرف
بستی کو چھوڑ کر وہ قلندر چلے گئے

اگتا نہیں ہے کوئی محبت کا اب شجر
دل کی زمین کر کے وہ بنجر چلے گئے

دفتر سے لے کے آئے تھے دفتر کو ساتھ ہم
پھر صبح گھر کے غم لیے دفتر چلے گئے

بیماریوں نے پہلے زمینیں فروخت کیں
پھر عورتوں کے جسم سے زیور چلے گئے

جن سے ہمیں امید تھی پھل پھول کی نفیسؔ
گلشن سے وہ درخت تناور چلے گئے

نفیس وارثی
ڈیہ پور کھیری ٹاؤن، ضلع کھیری
7379302972

ڈاکٹر عبد الغفار فاروقی
ٹیچر ضلع بیسک شکشا پریشد،لکھنؤ
9415576584

افسانہ

پیڑ کا رشتہ

چھوٹو کو اپنے دادا سے بہت پیار ہے۔گھر میں اس کے ماں باپ بھی ہیں مگر چھوٹو کو اپنے دادا کے ساتھ ہی رہنا اچھا لگتا ہے۔دادا چھوٹو کو کہانیاں سناتے ہیں۔اس کے ساتھ گاؤں گھومنے جاتے ہیں۔اور کبھی بھولے سے بھی اسے ڈانٹتے نہیں ہیں اور نہ کسی کو ڈانٹنے دیتے ہیں۔اس کے ساتھ کھیلتے بھی ہیں۔آج دادا اپنے پوتے چھوٹو کے لیے ٹوکرا بھر کے امرود لائے ہیں۔پیلے پیلے امرود دیکھتے ہی چھوٹو خوش ہوگیا۔دادا نے امرودوں کو دھو کر پلیٹ میں رکھ دیا۔اس کے بعد دونوں نے جی بھر کر میٹھے میٹھے امرود کھائے۔ چھوٹو نے اپنے امی ابو کو بھی امرود کھلائے۔ چھوٹو نے دادا سے کہا دادا اگر ہمارے گھر میں ایک امرود کا پیڑ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔جب جی چاہتا امرود توڑ کر کھاتے۔ہاں چھوٹو بیٹا امرود کا پیڑ پھل کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہمیں دیتا ہے۔"امرود کا پیڑ اور کون کون سی چیزیں دیتا ہے؟ دادا" چھوٹو نے پوچھا،دیکھو بیٹا امرود کا پیڑ جب بڑا ہو جاتا ہے تو ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے اور جس طرح سے نیم کے پیڑ کی پتیوں اور پھلوں سے بہت سی دوائیں بنتی ہیں اسی طرح امرود اور اس کے پتوں سے بھی دوا بنتی ہے۔امرود سے میٹھی میٹھی جیلی اور جیم بھی بنتا ہے۔اچھا جبھی تو!امی کے منہ میں چھالے نکل آئے تھے تو انہوں نے رمیش انکل کے وہاں سے امرود کی پتیاں منگائی تھیں،کلی کرنے کے لیے۔

ہاں چھوٹو بیٹا" منہ کے چھالوں میں اور پیٹ کی دوسری بیماریوں میں بھی امرود کی پتی اور امرود کام آتا ہے کیونکہ اس میں وٹامن سی،کیلشیم اور دوسری چیزیں پائی جاتی ہیں۔" امرود کا پیڑ سچ میں بہت اچھا ہوتا ہے اور اس کے کچا لو بھی تو بہت اچھے بنتے ہیں۔دادا! ہم اپنے گھر کے آنگن میں امرود کا پیڑ ضرور لگائیں گے" چھوٹو نے کہا "ٹھیک ہے میں کل ہی تمہارے لیے امرود کا پودا لے آؤں گا"

اگلے دن دادا صبح صبح امرود کا پودا لے آئے باہر کے دروازے سے ہی آواز دی چھوٹو تمہارے لیے امرود کا پودا لے آیا ہوں جب یہ پودا پیڑ بن جائے گا تو اس پر طوطے،کویل، مینا،بلبل،اور نہ جانے کتنی طرح کی چڑیاں آیا کریں گی۔واہ!تب تو بڑا مزہ آئے گا۔کوئل کی آواز کتنی میٹھی ہوتی ہے۔طوطے بھی تو ٹیں ٹیں بولتے ہیں۔بلبل پیڑ پر پھدکتے ہوئے کتنی اچھی لگے گی۔ہاں چھوٹو، پیڑ انسانوں، جانوروں اور پرندوں کے سب سے اچھے دوست ہیں۔پرندے پیڑوں پر ہی بسیرا کرتے ہیں اور اپنا گھر بھی بناتے ہیں۔دادا پیڑ تو بات نہیں کرتے پھر وہ ہمارے دوست کیسے بن سکتے ہیں۔دیکھو بیٹا جس طرح دوست تمہاری مدد کرتے ہیں اسی طرح سے بغیر تم سے بات کیے پیڑ بھی تمہاری مدد کرتے ہیں۔وہ کیسے دادا؟ یہ بات ٹھیک سے سمجھ لو پیڑ ماحول کی زہریلی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس لیتے ہیں اور ہمیں صاف ہوا یعنی آکسیجن دیتے ہیں۔آکسیجن نہ ہو تو ہم سانس نہیں لے سکتے یعنی زندہ ہی نہیں رہ سکتے" "تب تو پیڑ بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی دادا۔پھر بھی لوگ پیڑوں کو کیوں کاٹتے ہیں؟" چھوٹو نے بھولے پن سے پوچھا۔"روپے کی لالچ میں ۔۔۔۔۔۔وہ نہیں جانتے کہ پیڑوں کو کاٹنے سے ہوا میں زہریلی گیس بڑھتی جاتی ہے" "میں سمجھ گیا داد،پیڑ ہمارے سب سے پکے دوست ہیں" یہ لو لگا دیا امرود کا پودا۔دادا نے اتنا کہتے ہوئے پودے کے آس پاس تھوڑا پانی بھی ڈال دیا۔دادا میں اس پودے کو روز پانی دوں گا۔جب اس میں امرود لگیں گے تو ہم دونوں جی بھر کر کھائیں گے۔امی ابو کو بھی کھلائیں گے۔میرے بچے ہو سکتا ہو تیرے دادا اس پیڑ کے امرود نہ کھا پائیں،مگر میری سوغات تجھے ضرور ملتی رہے گی۔نہیں دادا آپ امرود ضرور کھائیں گے۔دادا نے پیار سے چھوٹو کا سر سہلا کر کہا اللہ تجھے خوش رکھے۔اس پیڑ کو اپنے دادا کی طرح ہی پیار کرنا۔

وقت گزرتا گیا۔ چھوٹو روز امرود کے پودے کو پانی دیتا۔ پودا دھیرے دھیرے پیڑ بن گیا۔ اس کے ہرے ہرے پتے سب کو اچھے لگتے۔ کچھ وقت بعد امرود کے پیڑ میں پھول آ گئے۔ بلبل بھی پیڑ پر پھدکنے لگی۔ کویل اور مینا بھی گیت گانے لگی۔ اور بھی کئی طرح کے پرندے پیڑ پر اکٹھا ہونے لگے۔ چھوٹو بہت خوش تھا۔ پر تب ہی اللہ نے اس کے دادا کو اپنے پاس بلا لیا۔ دادا کی موت پر چھوٹو بہت رویا۔ تب ہی اسے یاد آیا کہ دادا نے کہا تھا امرود کے اس پیڑ کو اپنے دادا کی طرح ہی پیار کرنا۔ چھوٹو اب امرود کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سبق یاد کرتا اسے گلے لگاتا۔ اسے لگتا یہ امرود کا پیڑ نہیں اس کے سر پر دادا کا سایہ ہے۔ چھوٹو جب بھی دادا کے لگائے پیڑ کے امرود کھاتا، اسے دادا بہت یاد آتے۔ چھوٹو کی ماں کہتی دادا چھوٹو کو امرود کھاتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہوں گے۔ چھوٹو کے والد کو ایک پریشانی تھی پیڑ میں جب امرود لگتے باہر سے بچے پتھر مار کر امرود توڑنے کی کوشش کرتے۔ ایک دن گھر کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ کچھ دن بعد چھوٹو کی ماں کا ماتھا پتھر لگنے سے پھٹ گیا۔ روز روز کے ان حادثوں سے تنگ آ کر چھوٹو کے والد نے امرود کا پیڑ کٹوانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن پیڑ کاٹنے والا کلہاڑی لے کر آ گیا چھوٹو نے پیڑ کاٹنے سے منع کیا۔ میں اس پیڑ کو نہیں کاٹنے دوں گا اسے دادا نے لگایا تھا۔ چھوٹو کے والد نے بہت سمجھایا کہ وہ چھوٹو کو بازار سے امرود لا دیں گے۔ پیڑ کی وجہ سے کھڑکی دروازے کے شیشے ٹوٹتے ہیں۔ امرود توڑنے کے لیے پھینکے گئے پتھر سے تمہارا سر بھی تو ایک بار پھٹ چکا ہے بھول گئے کیا؟ تمہاری ماں کا ماتھا تو ابھی اسی دن پھٹا ہے۔ چھوٹو بھاگ کر پیڑ کے تنے سے لپٹ گیا اور روتے ہوئے بولا ابو یہ امرود کا پیڑ دادا کی طرح ہمیں پیار کرتا ہے۔ اسے مت کٹوائیے۔ والد ہنس پڑے بھلا بے جان پیڑ چھوٹو کے دادا کی طرح پیار کیسے کر سکتا ہے۔ چھوٹو کہتا گیا جب پیڑ کی ڈالیاں ہلتی ہیں تو مجھے لگتا ہے جیسے دادا میرا سر سہلا رہے ہوں۔ پیڑ کی چڑیاں دادا کی طرح مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔ ماں نے بھی چھوٹو کو سمجھانا چاہا دیکھو بیٹا یہ بیکار کی باتیں ہیں۔ تم پیڑ سے الگ ہو جاؤ۔ نہیں امی یہ پیڑ ہمارا دوست ہے ساری زہریلی گیس لے کر یہ ہمیں صاف ہوا دیتا ہے ٹھنڈا سایہ اور میٹھے پھل دیتا ہے۔ بدلے میں ہم سے کچھ بھی نہیں لیتا۔ چھوٹو نے پیڑ کے تنے کو پیار سے سہلایا اور روتے روتے ہچکیاں لینے لگا۔ ماں سوچنے لگی چھوٹو کہتا تو ٹھیک ہی ہے یہ پیڑ تو بس ہمیں دیتے ہیں، لیتے کچھ نہیں پھر کیوں نہ چھوٹو کی بات مان لی جائے؟

تبھی پڑوس کی ریکھا آنٹی آئیں ان کی لڑکی کے منہ میں چھالے نکل آئے تھے۔ انہوں نے چھوٹو کی ماں سے امرود کے پتے مانگے تاکہ ان کی لڑکی ان پتوں کو ابال کر کلی کر سکے اور اس کے منہ کے چھالے ٹھیک ہو جائیں۔ شہر میں جمال چاچا کا بھی پیٹ خراب رہتا تھا اور کچھ دوسری بیماریاں بھی تھیں اس لیے ڈاکٹر نے ان کو بھی امرود کھانے کو بتائے تھے۔ تم ٹھیک کہتے ہو چھوٹو اب میں امرود کا پیڑ نہیں کٹنے دوں گی۔ ساتھ ہی ہم آم، لیچی اور نیم کے پیڑ بھی اپنے آنگن میں لگوائیں گے۔ ہاں بیٹا ہم غلطی پر تھے۔ پیڑ سچ مچ ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں پیڑوں سے پیار کرنا چاہیے" ابو نے بھی چھوٹو کی بات مان لی۔ امرود کا پیڑ کٹوانے کی بات سوچنے پر انہیں بہت پچھتاوا ہوا۔ ویسے پیڑ کٹوانے کی بات سوچ کر انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔ پر روز روز کے حادثوں سے وہ تنگ آ گئے تھے۔ ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ پیڑ پانی برسانے اور باڑھ روکنے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں، پیڑ کاٹنا ٹھیک نہیں ہے۔ ماں باپ کو مانتے دیکھ چھوٹو بہت خوش ہو کر بولا۔ کتاب میں ٹھیک لکھا ہوا ہے چھوٹو اب ہم پیڑ کاٹنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ پیڑوں سے پیار کا رشتہ جوڑنا ہی ٹھیک ہے۔ تبھی تو میں امرود کے پیڑ کو اپنے دادا کی طرح مانتا ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو چھوٹو تمہارے بابا تمہیں یہ پیڑ تحفے میں دے کر گئے ہیں۔ اس کے میٹھے پھلوں میں ضرور تمہارے دادا کا پیار چھپا ہے۔ میری اچھی ماں اور ابو جی۔ چھوٹو نے اپنی ماں کا ہاتھ چوما اور آنسو پوچھ کر کھیلنے بھاگ گیا۔ امرود کے پیڑ سے کوئل نے بھی خوشی کا گیت گایا کو۔۔۔کو۔۔۔کو۔۔۔

❑❑❑

غزل

صحرا کی خاک تن پہ سجائے چلے گئے
دیوانہ وار عشق نبھائے چلے گئے

وہ دوریاں تو ان کے لئے دوریاں نہ تھی
اکثر مرے خیال میں آئے چلے گئے

خواب و خیال وہم و گماں اضطراب و کرب
دردِ جگر کو اور بڑھائے چلے گئے

ہم سائے سارے ساتھ تھے پر مسئلہ یہ تھا
وہ لوگ نفرتوں کو بڑھائے چلے گئے

ہونٹوں پہ دل کی بات تو آنے سے رہ گئی
وہ راز تھا جو دل میں چھپائے چلے گئے

آنکھوں میں آئے خواب اسی انتظار میں
ہم خود کو ساری رات سلائے چلے گئے

منزل کی جستجو میں بھٹکتے رہے سدا
اک عمر کوششوں میں بتائے چلے گئے

صدام غنی
مکان نمبر۔13، کراس روڈ نمبر۔3، آزاد نگر، مانگو، جمشید پور
9631832842

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رضوی پی جی کالج، کراری، کوشامبی

7054003555

افسانہ

سیلاب

ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔سورج نے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔دن و دن بڑھتی ہوئی ہوس کی گرمی اور گناہوں کی تپش نے گویا آفتاب کی مغرور نگاہوں کو بھی جھکا دیا تھا۔سورج کی تپش نفسانی آگ کے آگے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔شنکر پٹیل کی بیٹی سنگیتا کو گھر سے بھاگے ہوئے آج دسواں دن تھا۔ ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی۔کوئی ماں باپ کو قصوروار کہتا کوئی بیٹی کو............کل گائیوں کو چراتے ہوئے چھوٹے پٹیل کا کا ادھر سے گذرے تو کہہ رہے تھے......''سب شنکر اور او کر مہر او کے دوش با......جب بٹیا گھنٹہ گھنٹہ بھر او کر دوکان پر ٹھاڑھت رہت رہے تب ان کر آنکھی سے ناہی دکھات رہا''(سب شنکر اور اس کی بیوی کا قصور ہے جب بیٹی گھنٹہ گھنٹہ بھر اس کی دکان پر کھڑی رہتی تھی تب ان کی آنکھوں سے نہیں دکھائی دیتا تھا؟)میرا آنٹی بھی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی......''صحیح کہہ رہے ہو کا کا جب جھولا بھر بھر کے پھری میں سامان لے جاتی تھی تو ان کو بڑا مجا آتا تھا''۔شانتی کا کی نے کہا......

''نہیں جی ایسن بات ناہی......کیئن بار شنکر بابو نے سنگیتا کو سمجھایا، ڈرایا اور مارا بھی مگر یہ جوان خون بڑا ہٹی اور ادھرمی ہے''۔

شنکر پٹیل کی بیٹی سن بلوغ کو پہنچنے ہی والی تھی اور طرۂ امتیاز یہ کہ وہ ایک غیر برادری اور غیر مذہب یعنی مسلم لڑکے کے ساتھ بھاگی تھی۔ برادری میں پٹیل کی ناک کٹ گئی تھی۔شنکر کو ڈر تھا کہ دیر ہوئی تو وہ دونوں جلد ہی شادی کر لیں گے۔اسی لیے ان دونوں کی تلاش ہر طرف جاری تھی۔ پولیس انہیں سی۔آئی۔ڈی۔کے کھوجی کتوں کی طرح ہر طرف ڈھونڈھ رہی تھی۔ پولیس کے سپاہی اور داروغہ گاڑیاں بھر بھر کے آرہے تھے۔محلّے، پڑوس اور بستی کے ارد گرد سبھی لوگوں سے تفتیش کر کے اس کیس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ شنکر پٹیل نے غنڈوں کا بھی سہارا لیا تھا وہ بھی جیپ میں کھلے عام سڑک کے سینے کو دہلاتے ہوئے بہ بانگِ دہل ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔مگر جیسے ایک ہُو کا عالم تھا۔اس بستی میں رہنے والا ہر شخص جیسے خود کو ہی قصوروار سمجھ رہا تھا۔زبان خاموش، کوئی چوں بھی نہیں کرتا تھا۔

مگر مغرور و غیور سورج کو بھی شاید اتنی گالیاں سن کر شرم آگئی تھی۔اس نے بادلوں میں خود کو ایسا چھپایا کہ آج ہفتہ بھر سے کسی کو اپنی شکل ہی نہیں دکھائی۔وہ سیاہ بادلوں کی زلفوں میں منھ چھپا کر زار و قطار رو رہا تھا۔گویا وہ بے قصور لوگوں کی بے کسی اور اپنی بے بسی پر رو رہا ہو۔اس کے آنسو مثل باراں برس رہے تھے۔اور ہم لوگوں کو یہ سکون تھا کہ غنڈوں کی آوا جاہی کم ہو گئی تھی۔ان کی بھدّی گالیاں بارش کے شور میں گم ہو جاتی تھیں اور ہمارے کان ان کے فحش مغلظات سننے سے بچ جاتے تھے۔ہم سب خوف زدہ تھے۔کیونکہ یہ علاقہ ٹھاکر، پنڈت اور پٹیلوں کا تھا۔مسلم برادری کے اکّادکّا خاندان تھے وہ بھی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر شنکر کی بیٹی کسی پنڈت یا ٹھاکر کے لڑکے کے ساتھ بھاگی ہوتی تو کوئی کہرام نہ مچتا بلکہ جلدی سے شادی کا پندال سجا دیا جاتا اور پٹیل کی چھاتی بھی چوڑی ہو جاتی کہ اسکی بیٹی اُچ ورگ کے چھتری یا براہمن کے ساتھ بھاگی ہے۔مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ معاملہ غیر برادری کا تھا وہ بھی ہندو اور مسلم کا۔اب تک سنگیتا کا کہیں پتہ نہیں لگا تھا کہ وہ لوگ کہاں چھپ گئے تھے۔ پولیس کے ساتھ شنکر پٹیل کے غنڈے بھی ان کو ڈھونڈنے میں زمین آسمان ایک کر رہے تھے۔

علی کے گھر والوں نے پولیس اور غنڈوں کی گالیوں اور مار سے ڈر کر دور کہیں رشتے داروں کے یہاں پناہ لے لی تھی۔ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔مگر''جو کے ساتھ گھن پستا ہی ہے''وہ بھی قانون اور سماج کی چکی میں پس رہے تھے۔علی کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ہر ایک سے ایک ہی سوال تھا......''کیا اسّی سالوں کی لمبی رفاقت کا یہی صلہ ہے؟''......وہ سب سے کہہ رہے تھے۔

''میری تربیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا''۔ بچوں سے غلطی ہوئی ہے صرف میرے بچے سے نہیں''...... ''شنکر تیری بیٹی کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا قصور میرے گڈو کا ہے''۔

وہ اشکبار آنکھوں سے سب کو دیکھتے رہے مگر کوئی بھی انہیں روکنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

بارش کا زور آٹھویں دن بھی نہیں ٹوٹا۔ گویا...... ''ابرِ رحمت اب قہرِ خدا بن گیا تھا'' زمین کے چوڑے اور گہرے سینے میں بھی اس پانی کو جذب کرنے کی قوت ختم ہوگئی تھی۔ ندیاں خطرے کے نشان سے اوپر بہہ رہی تھیں۔ تالابوں کے ظروف بھی بھر چکے تھے، کھیتوں میں پانی کمر کے اوپر تک چڑھ آیا تھا۔ اور پانی اب نالیوں اور دہلیزوں سے ہوتا ہوا نیچی سطح پر بنے ہوئے مکانوں میں دھیرے دھیرے گھس رہا تھا۔

بستی والے اس نئی افتاد سے پریشان ہو اٹھے۔ موسلا دھار بارش اور رات کے سناٹے کے دامن کو جھینگر اور مینڈکوں کی ٹرٹر چاک کر رہی تھی۔

اچانک تمام گھروں سے چیخنے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں...... ارے بچوں کو جگاؤ...... ارے بستر تو بچاؤ...... راشن تو ہٹاؤ''...... شور کی آواز سن کر خان صاحب کی بیوی نے اپنی بیٹی روشنی کو پکارا کہ ''بیٹا باہر دیکھو تو کیسا شور ہے؟'' آوازیں گڈمڈ ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا......'' ''امی کہیں شنکر کے غنڈے تو نہیں آگئے''...... روشنی کی چھوٹی بہن نے کہا...... ''ہم دروازہ نہیں کھولیں گے''............ ''ابو نے منع کیا ہے''......

''نہیں بیٹا دروازہ کھولو دیکھو تو باہر کیسی چیخ و پکار ہے؟''...... ''خدا پر بھروسہ رکھو تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوگا''۔ ماں نے دلاسہ دیا۔ روشنی نے ہمیشہ کی طرح بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے دروازہ کی کنڈی کھولی اور جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر اندھیرے کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ لگاتار بارش کی وجہ سے بجلی کے سسٹم بھی فیل ہوگئے تھے، مگر اب اڑوس پڑوس کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں تھیں۔ ''پانی گھسا پانی گھسا''......

بچوں کو اٹھاؤ...... بستر کو بچاؤ...... ''بکسے کے نیچے جلدی پتھر لگاؤ، چارپائی کو اینٹ لگا کر اونچا کرو''...... روشنی نے دروازے سے باہر بارجے کے نیچے کھڑے ہو کر پڑوسیوں کو آواز لگائی کیا ہوا میرا آنٹی''...... ''ارے بیٹا دیکھ نہ کمرے میں پانی بھر آیا''...... ''کدھر سے''؟ .... ''پیچھے نالی سے''............ جب تک جاگ پاتی سب بھیگ گیا سارے راشن میں گندا پانی بھر گیا ہے۔''...... ''یہ اندر دیوتا بھی نہ گریبوں (غریبوں) کو برباد کرنے پر تلے ہیں''۔ میرا آنٹی بڑبڑائی...... ''آنٹی بچوں کو لیکر ادھر آجاؤ...... امی بلا رہی ہیں......'' میرا انٹی روتی ہوئی آئیں اور اپنا دکھڑا رونے لگیں۔ ''دیکھو نہ دیدی''...... ''سارا بستر بھیگ گیا۔ جب تک پتھر لگا کر اونچا کرتی بڑے والے بکسے میں بھی پانی گھس گیا......'' ''غریبوں کی گرہستی برسوں میں پائی پائی جوڑ کر بنتی ہے اور ایک ہی جھٹکے میں اجڑ جاتی ہے''۔ میرا آنٹی اپنی بے چارگی پر رونے لگی۔ روشنی نے آگے بڑھ کر دوسرے کواٹر میں دیکھا تو سُد یشور کا کا کا بھی یہی حال تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے وہ سب زمین پر چٹائی بچھا کر سو رہے تھے۔ ''اچانک گیلے پن نے انہیں کچی نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ چھوٹا انل چلا رہا تھا......'' مائی میری کتابیں بچاؤ''...... ماں چلا رہی تھی...... ''گوپال کے پاپا جلدی بکسا کے نیچے پتھر لگاؤ ورنہ سب گرہستی برباد ہوئی جائی''۔ ایک افراتفری کا عالم تھا ہر کوئی نفسی نفسی کے عالم میں تھا گویا قیامت برپا ہوگئی ہو۔

روشنی نے بارش کا پانی دیکھا نہ رات اندھیرا، ان کی مدد کو نکل پڑی۔ غنڈوں کا ڈر دل کے کسی کونے میں چھپ گیا تھا۔ خان صاحب کے گھر والے اپنی نالیوں کو اینٹ اور بالیتھین ٹھونس کر بند کر کے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پانی ان کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ مگر یہ ان کی بھول تھی کیونکہ یہ پانی نہیں سیلاب تھا اور سیلاب جب آتا ہے تو اسے کوئی رخنہ یا باندھ نہیں روک پاتا پانی کو گھسنے کے لیے دروازوں کی ضرورت نہیں ہوتی صرف باریک درازیں اور کمزور بنیادیں ہی کافی ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جب پڑوسیوں کی مدد کر کے اپنے گھر میں آئے تو دیکھا بارش کا پاک پانی روئے زمین کی تمام گندگیوں کو سمیٹے بڑی شان سے ان کے بھی دو کمروں میں لہریں مار رہا تھا اور بلوں میں پانی گھسنے کی وجہ سے سانپ، چھچھوندر اور چوہے بھی لہراتے پانی میں ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ سب لوگ کسی طرح بچتے بچاتے اور نیچے اونچے پتھروں کے سہارے کمرے میں داخل ہوئے اور اونچے بکسے پر جا کر بیٹھ گئے کیونکہ رات تو کاٹنی ہی تھی جو کچھ بھی ہوتا صبح ہی ہوتا۔ خان صاحب کے گھر والے بھی پانی اور اپنی بربادی کا تماشا دیکھتے رہے۔ ماں نے دیکھا کہ روشنی کا کہیں اتا پتا نہیں ہے وہ بے چین ہوگئیں اور گھبرا کر روشنی کو ڈھونڈنے لگیں، روشنی کی چھوٹی بہن سے پوچھا ''روشنی کہاں ہے بیٹا''...... ''پتہ نہیں امی شاید میرا آنٹی کے یہاں ہوں''...... ''میرا روشنی کو بھیجو......'' ''دی دی میرے یہاں تو نہیں ہے......'' شانتی کے گھر دیکھ لو...... ''شانتی روشنی ہے کیا؟'' ...... دی دی گوپال بتا رہا ہے روشنی دی دی فیکٹری کی طرف گئی ہے''...... ابھی سب حیران اور پریشان ہی تھے کہ سب نے دیکھا روشنی خان صاحب کے ساتھ بھیگتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ماں مطمئن ہوگئیں۔ پڑوسیوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

صبح ہی صبح بستی والوں نے دیکھا...... بھانو کچھ آدمیوں کے ساتھ چلا آرہا ہے اور ان کے ہاتھوں میں پھاوڑے اور کدال ہیں۔ سب نے سوچا چلو بھانو کے دل میں رحم تو آیا۔ وہ ایسا انسان تھا کہ اپنے کھیت کی مینڈھ تک کسی کو چھونے نہیں دیتا تھا۔ اس کے آدمیوں نے کھیت کے باندھ کو کاٹنا شروع کیا تو پانی خود بخود چاروں طرف پھیل گیا اور آہستہ آہستہ غلاظتوں کو چھوڑ کر چپ چاپ نکل گیا۔ سب حیران تھے کہ یہ چمتکار کیسے ہوگیا؟............ بھانو صبح ہی صبح کیسے آگیا؟ نائٹ شفٹ کی ڈیوٹی کر کے مدھو کا کا فیکٹری سے لوٹے تو سیدھا خان صاحب کے دروازے پر رُکے۔ تھوڑی ہی دیر میں بستی کے سارے لوگ سورج بھان کا کا، شنکر پٹیل کا کا، راجن ٹھاکر، سنتوش تیواری سبھی چلے آرہے تھے اور ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں خان صاحب کی پیٹھ تھپ تھپا رہا تھا۔

''بھئی خان صاحب بیٹیا ہو تو آپ کے جیسی...... ''بھگوان ہر کسی کو آپ کی بیٹی جیسی بیٹی دے۔''...... ''خان صاحب'' ای کیول آپ کی بیٹیا نہیں ہم سب کی بٹیا ہے۔ اس کی بہادری اور سوجھ بوجھ نے پورے گاؤں کو بچا لیا''۔

بارش بھی تھم چکی تھی۔ سورج شرماتا ہوا نکل آیا تھا۔ ہرے بھرے درخت غسل باراں کے بعد اپنے گیسوؤں کو جھٹک کر ان گنت موتی زمین پر بکھیر رہے تھے۔ سیلاب بھی جا چکا تھا۔ سنگیتا اور گڈو کی خبر بھی مل چکی تھی کہ وہ جبل پور میں پکڑ لیے گئے تھے اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھے۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

❑❑❑

سمینہ خان

محلہ چوب داری، چوک، لکھنؤ

9452662586

مترجم شعیب نظام

افسانہ

پناہ گاہ

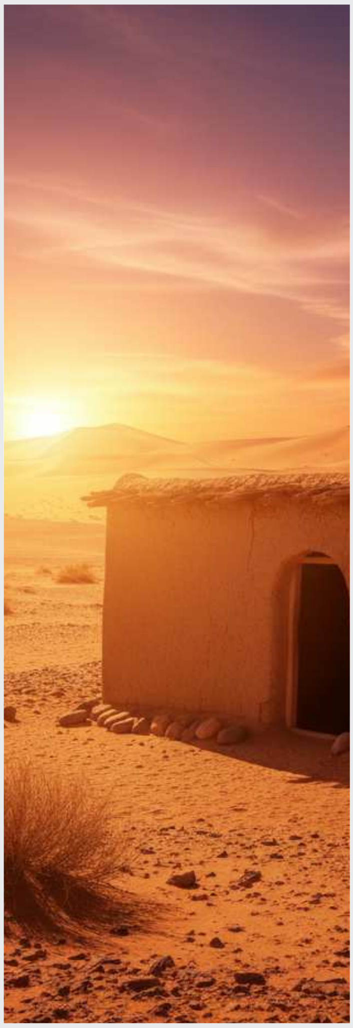

کھٹاک! کٹ۔کٹ۔کٹ۔کٹ۔کٹ۔۔۔دہلیز سے دور ہوتے قدموں کی آواز۔کھٹاک کے بعد بجنے والے پانچ کٹ کا مطلب لمبی فرصت۔یعنی سناٹا دیر تک برقرار رہنے والا ہے۔انٹرلاک میں چابی پانچ بار گھمانے کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ یہ کٹ کٹ لمبی آزادی کا بگل ہے۔اس آواز کے بند ہوتے ہی دروازے کے اندر کا نظارہ۔مکان میں خاموشی، سناٹا، اپنی جگہ پر تھما جھلملاتا سا ہر سامان بند کھڑکی دروازے کے باوجود ہلکی روشنی اندھیرے سے ٹکر لیتی سفید دیواریں۔اس انٹرلاک کی آواز نے ایک باخبر سنسار کو بے خبر کر دیا۔سنسان مکان میں زندگی کی ہلچل صاف محسوس ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک الگ دنیا وجود میں آتی محسوس ہوئی۔

اس سناٹے کے بیچ حرکت کی پہل گھڑی کے برابر میں ٹنگے فریم سے ہوئی۔ڈائناسور کے گھرانے والی چھپکلی نے آدھی کھوپڑی باہر نکالی۔معائنہ کیا کہ واقعی اکیلا پن حقیقت ہے تو خوشی سے گول ہوتی ہوئی بنا کانچ والی آئل پینٹنگ پر جم گئیں۔پینٹنگ میں پیڑوں کے جھرمٹ پر جمی گرد کی پرت نے کلا کاری کو کچھ دھندلا کر دیا تھا جس پر ہلکی جھلی والی چھپکلی ذرا نکھر کر آ رہی تھی۔

جن کے پرکھے ڈائناسور بن کر اس دھرتی پر راج کرتے تھے وہ آج دو بائی تین کے فریم میں ٹہلنے کے لیے مالکن کے لمبے وزٹ کے انتظار میں کان کھڑی رکھتی ہیں۔جس عیاشی سے انہوں نے فریم پر ڈیرا ڈالا تھا اسے دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ گوا کے بیچ پر پہلے سَن پھر مون باتھ کا مزہ لینا ہے۔اچانک کسی خیال نے ان کے آرام میں دخل دیا تو خود کو ذرا سی زحمت دے کر پہلے بائیں دیکھا اور پھر گردن 180 ڈگری گھماتے ہوئے دائیں دیکھنے کے بعد ریلیکسیشن کی حالت میں واپسی کی۔

چھپکلی اور مالکن دونوں کو ہی پتہ تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی نگرانی میں ہیں۔فریم کے اوپر موجود چھپکلی بھی بھری دوپہر میں یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ مالکن نے اس کے وجود کو قبول کر لیا ہے۔اس نے راحت کی سانس لی اور مالکن کی آواز اپنے کانوں میں محسوس کی۔'' ٹھیک ہے،ٹھیک ہے،رہ لو یہاں، مگر آبادی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔بس تمھیں ہی اجازت دے رہے ہیں۔'' چھپکلی کو بھی پتہ تھا کہ ان کے لئے فریم تک پہونچنا اور اسے بھگا دینا ممکن نہیں، مگر جس خیال کو خود پر حاوی کیا، وہ یہ تھا کہ شاید بہت دن تک اس لکاچھپی والے ساتھ نے مالکن کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ بنا دی ہو۔

مسز روتھ اس چمچماتے ہوئے مکان میں دو برس سے اکیلی رہ رہی تھیں۔مسٹر فریڈرک کے جانے کے بعد بیٹے نے انہیں اپنے پاس نیوزی لینڈ بلانا چاہا مگر ان کے لیے اس گھر کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔بیٹے کو بس اتنا ہی کہا تھا'' اس معاملے میں میرے ساتھ زبردستی مت کرنا کوئی قسم نہیں کھائی ہے، مگر جب تک ممکن ہوگا یہیں رہنا چاہوں گی۔"

ڈینیل ماں کو جانتا تھا ان سے بس اتنا ہی کہا۔"میرے لیے چھٹیوں میں آنا ہی ممکن ہوگا باقی آپ جب چاہیں میرے ساتھ آسکتی ہیں۔للی کو بھی کوئی اعتراض نہیں اور بچے بھی آپ کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔"

مسٹر فریڈرک کا بنوایا مکان اور ان کی آدھی پنشن مسز روتھ کے لیے کافی تھی۔وقت گزاری کے لیے وہ صبح 10 بجے سے دوپہر دو بجے تک کا وقت گھر سے کچھ دور اولڈ ایج ہوم میں بتاتیں اور رات کا کھانا اس طرح پکاتیں کہ اگلے دن دوپہر میں

گرم کر کے کھایا جا سکے۔ناشتہ بریڈ و انڈے والا ہوتا۔ہفتے میں ایک دن پھل بھی خرید لیتیں۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر کی چہل قدمی اور سونے سے پہلے تھوڑا سا پڑھنا کبھی کبھار ویک اینڈ پر شہر کے دوسرے سرے پر رہنے والی اپنی بہن کے گھر چلی جاتیں۔ یہاں سے واپسی میں اتوار کی شام ہو جاتی اور اگلے دن سے پھر وہی روٹین۔

کمرے سے باہر کھلنے والا دروازہ پوری طرح سے کھلا تو نہیں تھا مگر لابی کا کافی نظارہ کرا رہا تھا۔کھلے دروازے سے فرج کا ایک حصہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔جس سرمئی ریفریجریٹر کی چھت پر الّم غلّم سامان سلیقے سے رکھا تھا۔اسی فرج کے قدم ہم رنگ فائبر کے اسٹینڈ پر جمے تھے۔اگلی حرکت اسی اسٹینڈ پر ہوئی۔فرج کے پایوں کو تھامے اس فائبر اسٹینڈ کے چاروں گول کونوں کے بیچ جو برج جیسا گلیارہ تھا وہاں سے وہ سرکتی ہوئی دروازے کے پاس والے گولے پر ٹک گئی اور منہ باہر نکالا۔یہ کمسن سی چوہیا تھی۔کم عمری اس کی تنی ہوئی کھال اور چمکتی آنکھوں سے نظر آ رہی تھی۔دہشت کچھ کم تھی مگر مستعدی فطرت کا حصہ تھی۔گردن کے گھومنے سے بالوں کی جو لہر بنتی تھی اس کی چمک بھی کمسنی کی چغلی کر رہی تھی۔ان کے تنے ہوئے کان سرویلانس موڈ پر تھے۔سناٹے کے شک کو یقین میں بدلتا پایا تو سب سے پہلے دبی ہوئی دُم نے خوشی منائی اور نازک سے بدن نے بڑی ہی پھرتی کے ساتھ زمین پر چند کلاچیں بھر ڈالیں۔

اس لوہے اور کنکریٹ والے مکانوں نے بل کا کنسپٹ ہی ختم کر دیا ہے۔بس باتیں ہیں بڑی بڑی۔'کچے مکان بڑے اچھے ہوتے تھے'،گھڑے کا پانی بہت میٹھا ہوتا تھا۔اس نادان نے بھی سنا ہے کہ پہلے زمانے میں پکا کھانا فریج میں اور کچا ڈبوں میں سیل نہیں رہتا تھا۔تب کا انسان کھانے کھلانے کا شوقین تھا بوروں میں اناج رہتا تھا،ٹوکری میں سبزیاں اور ڈلیا میں بچی روٹی کا کچھ کچھ حصہ ان کے بلوں کو بھی گلزار کر دیا کرتا تھا اگر کوئی چیز کسی پابندی کے گھیرے میں آئی تو انہیں بھی اپنے دانتوں کی تیزی آزما لینے کا پورا حق تھا۔فی الحال تو گز بھر زمین اور اپنے حصے کی آزادی سیلیبریٹ کرنے میں وہ اتنی مگن تھی کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا۔ ریفریجریٹر سے سٹی گرینائٹ کی کچن ٹیبل پر جلدی ہی چھوٹے چھوٹے کاکروچوں نے اپنی حکمرانی شروع کر دی۔ پتہ نہیں کب سے گیس برنر کی پائپ لائن اور ناب میں دم سادھے بیٹھے تھے۔کھلی ہوا میں سانس لینے کا ہے انہیں کوئی شوق تو نہیں تھا،بند نالیوں اور سیلن میں ہی ان کی زندگی گزر جاتی ہے لیکن یہ سوچ کر باہر نکل ہی آئی ہیں کہ بنا خطرے،علاقے کا جائزہ لینے کا موقع بھلا کیوں کھو دیا جائے۔کیا انہیں نہیں پتہ کہ ان کے خاتمے کے لیے بڑے پختہ انتظام مالکن نے کیے ہیں؟ جہاں ان کی برادری کے کسی بندے نے باہر نکلنے کی غلطی کی،وہیں ایک زہریلے اسپرے نے اسے تڑپا کر مار گرایا۔موت سے پہلے لوٹتے پوٹتے کتنے ہی ساتھیوں کو بدلی کروٹ کے ساتھ ہوا میں اپنے پیر اور پر پھڑ پھڑاتے دیکھا ہے۔گرینائٹ پر پڑے پڑے خود سے ہی سوال کیا۔"ترقی تو ہم نے بھی کی ہے۔گمے پر رکھے سل بٹے کی دراروں سے نکل کر ہماری نسل آج مِکسر کے ڈھانچے تک شفٹ ہو چکی ہے۔انسانوں کو یہ تو سوچنا ہی چاہیے کہ آخر ہم سب بھی تو اس دنیا اور قدرت کا حصہ ہیں جن کے مینٹیننس کے لیے ایک ٹکے کا بھی خرچہ نہیں۔ان کے خاتمے کے لیے اتنی موٹی رقم! یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دو کوڑی کی جھونپڑی گرانے کے لیے لاکھوں کا میزائل داغ دیا جائے۔واہ رے اشرف المخلوقات۔اتنی چھوٹی ہے تمہاری سوچ۔باتیں تو بہت بڑی بڑی کرتے ہو کہ چار دن کی زندگی اور ہم چار پل والوں کی عمر سے اتنی نفرت!"

پتہ نہیں کس کونے سے تین چار مکھیاں برآمد ہوئیں اور کمرے میں اڑان بھرنے لگیں۔ کمرے میں سناٹا تھا اب ڈیجیٹل گھڑی آ جانے کے بعد سے ٹک ٹک کی آوازیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔بھن بھن کا شور کسی کو بھی بتا سکتا تھا کہ اس کمرے میں کون گردش کر رہا ہے۔ایک گستاخ نے تو حد ہی کر دی سیدھا اس فریم پر جا بیٹھی جس میں کانچ کے پیچھے سے جوان مسز روتھ مسکرا رہی تھیں۔بلیک اینڈ وائٹ مسز روتھ۔مکھی نے بھی بڑے اطمینان سے ان کے نین نقش کا معائنہ کیا اور ان کے ماتھے پر چند کالے ذرے چھوڑ کر اڑ لی۔

سارے کھڑکی دروازے بند ملے تو شیطان کی خالہ عرف بلی موسی نے بڑی مایوسی سے اس جنگلے سے اندر جھانکا جس نے گھر کے آنگن جیسے آزاد علاقے کو بھی حفاظت کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ایک تو داخلے کے سارے راستے جام،اس پر اٹھکیلیاں کرتی چوہیا نے موسی کی سانسوں کو ہلکی غراہٹ میں تبدیل کر دیا۔وقت کے ساتھ کہاوت بدلی اور کھسیانی بلی جنگلا نوچتی نظر آئی۔کمسن چوہیا نے فرج کے اسٹینڈ میں پناہ لے کر اپنا سر باہر نکالا ایک بار جنگلے کی طرف دیکھا پھر مسز روتھ کے بیڈ کی طرف اور چیں چیں کی آواز میں زور سے کہا تھینک یو مسز روتھ۔جلد ہی زیرہ بیکٹیریہ صفائی والے گھر کی پول چیونٹیوں کی اس قطار نے کھول دی جو ریفریجریٹر پر رکھی ایک شیشی کی طرف دھاوا بول چکی تھیں۔بھرپور صاف صفائی کے بعد بھی کھانسی کے سیرپ سے ٹپکی ایک بوند۔اس اندیکھی کا سائلنٹ نقارہ پتہ نہیں کب اس فوج کو باخبر کر گیا۔چیونٹیوں کا قافلہ بوتل کو گھیر چکا تھا کئی جانباز چیونٹیاں اس چڑھائی تک پہنچ چکی تھیں جہاں ڈھیلے ڈھکن سے یہ گستاخ بوند باہر آئی تھی۔

سوکھے پڑے واش بیسن کی جالی سے کچھ بھاری بھرکم تل چٹے ہوا خوری کرنے باہر آ گئے تھے۔مگر صاف صفائی اور سوکھے پن سے انہیں کوئی خاص سروکار نہیں تھا اس لیے زیادہ انجوائے نہیں کر پا رہے تھے ان کے جسم نہیں، لمبے اینٹینا حرکت میں دِکھے آخر سینیئر سٹیزن ٹھہرے،تجربہ زیادہ ہو تو جسم آرام کا حقدار ہو ہی جاتا ہے۔دکھوں کا پہاڑ تو رائی برابر مچھر کے حصے میں تھا۔دن بھر پردے کے پیچھے پڑا رہتا اور رات کو جب قطرہ بھر خون کی تلاش میں نکلتا تو وہ گھیرا بندی،جیسے سرحد پار کے دشمنوں سے ٹکر لینے کا انتظام کیا گیا ہو۔دھوپ اور ہوا بھلے ہی رک جائے مگر گھر میں داخلے کی ہر جگہ پر جالی تنی ہوئی ہے۔پنکھا کولر بند کرنے کا موسم آیا تو اپنے ہی چاروں طرف مچھر دانی تان لی اتنے پر بھی چین نہیں ملا تو کبھی کسی اگربتی کا دھواں اور کبھی کوئی بجلی سے چلنے والا ہتھیار۔ذرا ہوا میں لہراتے دیکھا تو فوراً چارج کیا ہوا ریکٹ دے مارا۔جب تب کوئی نہ کوئی اسپرے،بس چلے تو علاقے کے کارپوریٹر سے کہہ کر فاگ والی گاڑی سے صبح دوپہر شام دھوئیں کا بونڈر گزروا دیں۔ہر دن بازار اور بھی زیادہ پاورفل ماسکیٹو کلِر پیش کر رہا ہے اس کے باوجود اگر موقع ملتا ہے تو کھلی کتاب میں ہی قبر بنانے سے نہیں چوکتا ہے یہ ظالم انسان۔اس نے دل ہی دل میں سوچا، محض ایک قطرہ خون کی خاطر کتنی بڑی جنگ میں خود کو مبتلا کر لیا ہے مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ جس کی بغاوت میں اتنا ہتھیار جمع کیا ہے اس کا نام گبریا کھڑک سنگھ نہیں،مچھر کی اولاد رکھا ہے اسے یہ خیال بھی کوندا۔نہ میرے پاس رہنے کا گھر نہ جینے کی گرہستی،زندگی بھی بہت چھوٹی ہے مگر میری موت کا اتنا سامان ہے کہ خود پر فخر کرنے کا دل چاہتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح اگر کوئی اپنی لگن میں مگن تھا تو وہ تھیں مکڑی میڈم! خوب اچھے سے انہیں پتہ تھا کہ ہفتہ 10 دن کے اندر ویکیوم کلینر میں ان سے دشمنی والا پائپ سیٹ کر کے ان تمام بنی جھالروں کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔جالا بنتے بنتے مکڑی جذباتی ہو گئی اور خود سے ہی بتیانے لگی۔"یہ ظلم تو ہماری قوم نے صدیوں سے جھیلا ہے کسی زمانے میں جھاڑو سے ہمارے خلاف جنگ لڑی جاتی تھی۔بدلتے وقت کے ساتھ کئی طرح کے برش وجود میں آئے اور اب اس ویکیوم کلینر پر بات رکی نہیں ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی جس کاریگری سے پہلے جالا بنا جاتا تھا اس میں آج تک رتی برابر فرق نہیں آیا ہے۔انہیں تو ہمارے ہنر کی قدر کرنی چاہیے۔

'تو کیا لے کے آیا تھا اور کیا لے کے جائے گا' کے پھنڈے پر کام کرنے والی اس قوم کو پتائی کر کے جب جب ان کے علاقے سے بے دخل کیا گیا تب تب انہوں نے اسی شدت سے اپنا آشیانہ پھر وہیں تعمیر کیا۔ جہاں موقع ملا ذرا سا جالا بن دیا اور جیسے ہی لمبی فرصت ہاتھ آئی تو اپنے ہی تار پر تیرتی ہوئی کئی فٹ نیچے تک نظارہ کر لیا، مالکن مانے یا نہ مانے مگر مکڑی خود کو صفائی مہم کا حصہ مانتی ہے، جسے اس بات پر اعتراض ہو وہ خود آ کر دیکھ لے کہ کتنے کیٹ پتنگے اس کے بنے جال میں آ کر پھنستے ہیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں مگر اس نے نہ کبھی غرور کیا اور نہ ہی شکایت۔ بس اپنے کام سے مطلب رکھا۔ اچانک پُھر کے ساتھ پھڑ پھڑاہٹ کی آواز نے سبھی کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چھپکلی نے فریم پر ہی دم سادھ لیا مگر چوہیا نے لمحے بھر میں خود کو محفوظ کرنے کے ساتھ ماجرہ بھی سمجھ لیا تھا۔ جنگلے سے ایک ساتھ چڑیا اور چڑا داخل ہوئے تھے ان کی چونچ میں دال اور چاول کا دانہ نہیں بلکہ گھاس پھوس کے الجھے ہوئے تنکے تھے۔ اکثر ادھر آتے اور پنکھے کے اس کپ میں گھونسلہ بنانے کی کوشش کرتے جس کا رخ چھت کی طرف تھا۔ کمرے کے سناٹے میں خود کو پرواز کرنے سے روک نہیں پائے اس موج مستی میں ایک تنکا اور کچھ کوڑا بیڈ پر گرا جو پچھلی صفائی کے بعد بھی کٹورے میں جمع رہ گیا تھا۔ کپڑے کی چٹ، روئی کے ریشے اور کچھ الجھے سے دھاگے۔ یہ سب کسی پرانے پھیرے کی جمع پونجی تھے۔ بیڈ پر اس بکھرے سامان سے بے فکر دونوں اپنے کھیل میں مگن تھے۔ کبھی ٹکراتے تو کبھی ایک دوسرے سے چونچ لڑاتے اس دھما چوکڑی نے کہیں پاس گشت لگاتی بلی کو ایک بار پھر سے تاک جھانک کے لیے مجبور کر دیا۔ کلا چیں بھرتی چوہیا کو ہضم نہ کر پانے کا غم کم نہیں تھا، اڑان بھرتے اس جوڑے نے جو زخم دیا اس نے موسی کی آہ کو بڑی بھاری غراہٹ میں بدل دیا تھا۔ چڑیا اور چڑے نے دبک کر پنکھے کے اوپری کٹورے میں پناہ لی۔ قید کی یہ آزادی موسی کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی بیچاری اس بار بھی کھسیاہٹ میں لوہے کے جنگلے کو نوچ کر رہ گئی تھی۔ مسز روتھ بہن کے گھر سے ایک رات اور دو دن گزار کر آتی تھیں۔ اتنی لمبی آزادی ان سبھی کو بور اور بے حال کر دیا کرتی۔ چھت کی مکڑی ہو دیوار کی چھپکلی یا پھر فرج کے پیچھے چھپی کمسن سی چوہیا۔ مالکن کی غیر موجودگی میں سبھی اوب چکے تھے کسی کے بھی جیون میں جیسے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ ٹکٹکی باندھے یہ سب انٹرلاک کی کٹ کٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار ختم ہوا۔ انٹرلاک سے ایک بار پھر پانچ بار کٹ کٹ کی آواز آئی اور پورے گھر میں موجود ہر جاندار ہستی نے مستعدی کے ساتھ اپنی اپنی پوزیشن لے لی۔

مسز روتھ کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ اپنی پناہ گاہ میں واپس آ کر خوش ہیں۔ بستر پر پڑے تنکے دیکھ کر مسکرائیں، پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا، پہلے بستر کی چادر بدلی پھر اپنے کپڑے۔ آج چہل قدمی کا من نہیں تھا۔ ہاتھ میں کتاب لیے ڈینیل سے باتیں کرتی اپنے بستر پر آ گئیں۔ "ہاں میں آرام سے پہنچ گئی ہوں۔ کیتھی اور بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت بیتا۔" مسز روتھ کے ہاتھ کی کتاب گود میں تھی۔ ناک پر رکھے ریڈنگ والے چشمے کو ذرا نیچے سرکاتے ہوئے انہوں نے سکون سے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ چوہیا نے محسوس کیا کہ مالکن سے نگاہ چار ہوئی ہے اور وہ جھٹ پٹ فرج کے پیچھے گم ہو گئی۔ پھسلتی نگاہیں چھت کے کونے پر موجود مکڑی کو دیکھ سکتی تھیں مگر اس نے چھپنے کی کوشش نہیں کی ان کی گھومتی گردن اب فریم پر تھی۔ چھپکلی نے جیسے مسکرا کر کہا" گڈ نائٹ!" اور فریم کی آڑ میں آرام کرنے چلی گئی۔ مسز روتھ نے ناک پر رکھا چشمہ اتارا، کتاب اور چشمے کو سائڈ ٹیبل پر رکھا، لیمپ کا سوئچ بند کیا اور ان کے منہ سے نکلا" گڈ نائٹ!" لیٹتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں" ڈینیل تمہیں کیسے بتاؤں کہ یہاں میں اکیلی نہیں۔"

❑❑❑

غزل

اس قدر تم جو میرے دھیان میں ہو
ایسا لگتا ہے آسمان میں ہو

میری غیبت سے باز کیسے رہے
آپ تو میرے خاندان میں ہو

دھوپ مفلس کی کیوں جلائے تمہیں
تم تو دولت کے سائبان میں ہو

تم سے اظہارِ عشق بھی نہ ہوا
جبکہ تم صاحب بیان میں ہو

دنیا جاگیر میں کسی کی نہیں
تم کرائے کے اس مکان میں ہو

آسماں دفن ہیں زمیں میں کئی
احمقوں کون سی اڑان میں ہو

عشق کرنے کے بعد بھی مظہرؔ
کب بھلا اُس کے تم گمان میں ہو

مظہر میاں
کھاری کنواں، جین انٹر کالج، رام پور (یوپی)
9927103914

علی شاہد دلکش

ہرنچوارہ، گھگوماری، کوچ بہار، مغربی بنگال

9831444963

تبصرہ

رات ڈھلنے کو ہے

زیرِ تبصرہ کتاب ’’رات ڈھلنے کو ہے‘‘ نسیم اشک کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ چوبیس مختلف پھولوں کے ایک خوبصورت گلدستے جیسا ہے۔نسیم اشک ایک ذہین افسانہ نگار کا نام ہے۔حالات کی بھٹی میں تپ کر ادبی بلوغت پانے والے اشک کو اپنے معاصر حالات کا گہرا شعور ہے۔لہٰذا اپنے اردگرد کے ماحول پر خوب معروضی نظر ڈالتے ہیں۔نتیجے میں ان کا جمالیاتی حس، سنجیدہ افکار اور ذہنی رسیدگی عصری زندگی کے امتیازات و مسائل کی کوکھ سے افسانے کے مواد کو جنم دیتے ہیں۔ان میں کہیں کہیں حالات حاضرہ اور ماضی کے موضوعات ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔’بونے لوگ‘، ’چیختے زخم‘، ’لاحاصل‘، ’آخری سفر‘، ’کھویا جہاں‘، ’راہیں الگ الگ‘، ’اندھی روشنی‘ اور ’مٹتی تصویریں‘ جیسے مختصر افسانے مذکورہ سلسلے کی کڑی ہیں۔حالانکہ زیرِ نظر کتاب ’’رات ڈھلنے کو ہے‘‘ میں مختلف موضوعات پر کل چوبیس (24) افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کے عنوانات و موضوعات اِس بات کو صاف کرتے ہیں کہ انھوں نے روایتی افسانہ نگاری سے ذرا سا انحراف کرتے ہوئے تخیل پر حقیقی کہانیوں کو ترجیح دی ہے۔نسیم اشک نے پلاٹ اور کردار نگاری میں سنجیدگی سے اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔منظر نگاری کو بھی حقیقیت سے قریب تر رکھا ہے۔افسانہ ’بونے لوگ‘ میں انسانی تفکرات میں بونا پن، اخلاقی گراوٹ اور تہذیبی پستی کی جانب خوب اشارہ کیا ہے۔ یہ افسانہ علامتی اور اشارتی افسانے کی تمثیل ہے۔دلیل کے طور پر اس کے چند فقرے قاری کی قرأت کی دہلیز پر رکھتا ہوں۔

(1) ’’کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے کچھ کھڑکی دروازوں کو بند کر کے ان کو یاد کر رہے ہیں‘‘۔(2) ’’دوبارہ کسی نے لیپا پوتی نہیں کی‘‘۔ (3) ’’تین ٹانگوں والی بینچ‘‘۔(4) ’’لوگوں کی سرد آہوں کے ساتھ پانی ابل رہا ہے‘‘۔

بیشتر افسانے کی بنت کاری، پلاٹ اور اس کے بیان میں تسلسل خوب ہے۔افسانچہ ’آخری زیور‘ میں افکار اور افلاس کو جذباتی رنگ سے پیش کرنے میں کامیاب پیغام رسانی کا کام ہوا ہے۔اس کا دل چھوتا جملہ پیشِ نظر ہے: ’’انجم کا اکلوتا زیور ’سیندور‘ بھی اس سے چھن گیا‘‘۔

متذکرہ افسانوی مجموعہ قابل توجہ بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔البتہ کہیں کہیں فقرے میں لغزش معلوم ہوتی ہے۔ذرا سا اُلٹ پھیر کے ذریعے اچھا نتیجہ سامنے آسکتا ہے۔مثلاً ’’موسمِ بہار میں پھول کھلے یا نہیں، اس سے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی بھوکا تو سویا نہیں‘‘ کی جگہ یوں کر دیا جائے ’’موسمِ بہار میں پھول کھلے یا نہیں، سے زیادہ ضروری ہے، کوئی بھوکا تو نہیں سویا‘‘۔(ص:-103)۔اسی طرح ’’وہ متعجب ہو کر مجھے دیکھنے لگا اور کہا‘‘ کی جگہ ’’وہ متحیر/ خیرہ/ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا‘‘۔(ص:-102)۔ٹھیک اس رو میں ’’اپنے کوکھ‘‘ کی بجائے ’’اپنی کوکھ‘‘۔ غالباً ذہنی آسودگی نہ ہونے پر یا عجلت میں اس قسم کی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔ورنہ بیشتر قلمکاروں کو ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے فن کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔اس میں حسن ظن کی فطری امور کی بہتر عکاسی کی گئی ہے۔ جملوں میں کسی قسم کا کوئی جھول نہیں۔ساتھ ہی موصوف نے کہانی پن کو بھی قائم رکھا ہے۔چونکہ طویل مکالمے طبیعت پر بارِ گراں معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کا خیال کرتے ہوئے مکالمے کو مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر نسیم اشک کی افسانہ نگاری کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک اصلاح پسند کہانی کار ہیں جو اپنی افسانوی تخلیقات سے سماج و معاشرے کی اصلاحات کی غرض سے پیغام رسانی کا ادبی کاذ کرتے ہیں۔افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ جناب نسیم اشک ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔لہٰذا اپنی شاعر و ادیب کی پہچان کو مستحکم کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب (رات ڈھلنے کو ہے) کے نام کو غنائیت سے پُر رکھا ہے۔واضح طور پر ’’رات ڈھلنے کو ہے‘‘ کے افاعیل ہیں فاعلن فاعلن۔نتیجتاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نثری کتاب کے عنوان کو شعری جامہ دینا، نمکین نثر کی جانب خوش آئند ادبی پیش رفت ہے۔امید کرتا ہوں افسانوی ادب میں یہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ان کی فکشن نگاری کا ٹریلر ثابت ہو، جس کی پوری فلم کے لیے مستقبل منتظر ہے۔’’رات ڈھلنے کو ہے‘‘ پر ذاتی آرا کے اظہار کی کاوش میں میری رات ڈھلتے ڈھلتے آخری پہر تک پہنچ چکی ہے اب قلم اجازت نہیں دے رہا ہے۔اس لیے قلم کو کچھ وقفے کے لیے آرام دیتا ہوں۔

❏❏❏

رات ڈھلنے کو ہے

نام کتاب : رات ڈھلنے کو ہے

مصنف : نسیم اشک

ضخامت : 140 صفحات

قیمت : 400 / روپے

ناشر : نسیم اشک/ بھارت آرٹ بریس، کولکاتہ

مبصر : علی شاہد دلکش

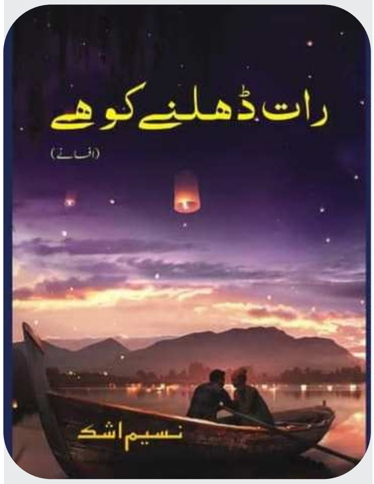

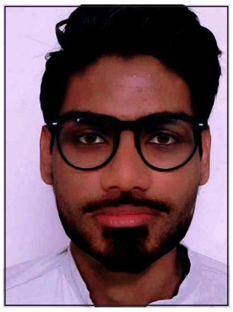

ہشام غزالی

عمر ہاؤس، مولوی گنج، امین آباد، لکھنؤ

7007906923

ترقیات

اتر پردیش کے کسان ہوئے خوشحال

اتر پردیش میں کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی اہم سرکاری اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں تاکہ ان کی مالی حالت بہتر ہو اور زرعی ترقی ہو۔ یہاں کچھ اہم اسکیموں کی تفصیل ہے:

1. پردھان منتری کسان سمان ندھی یوجنا: یہ ایک مرکزی حکومت کی اسکیم ہے، جسے اتر پردیش میں بھی نافذ کیا گیا ہے۔ اس کے تحت، چھوٹے اور درمیانے درجے کے کسانوں کو سالانہ 6,000 روپے کی مالی امداد دی جاتی ہے۔ یہ رقم تین برابر قسطوں (2,000 روپے فی قسط) میں براہ راست کسانوں کے بینک کھاتوں میں منتقل کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد کسانوں کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔

2. فصل بیمہ یوجنا اتر پردیش میں پردھان منتری فصل بیمہ یوجنا (PMFBY) کو مؤثر طریقے سے نافذ کیا گیا ہے۔ یہ اسکیم کسانوں کو قدرتی آفات جیسے سیلاب، خشک سالی، اور اولے باری کی وجہ سے ہونے والے فصلوں کے نقصان سے بچاتی ہے۔ کسانوں کو بہت کم پریمیم ادا کرنا ہوتا ہے، اور باقی پریمیم حکومت ادا کرتی ہے۔ فصل کے نقصان کی صورت میں انہیں مالی معاوضہ ملتا ہے۔

3. کھیت تالاب یوجنا اس اسکیم کا مقصد کسانوں کو اپنے کھیتوں میں چھوٹے تالاب بنانے کے لیے مالی امداد فراہم کرنا ہے۔ یہ تالاب بارش کے پانی کو ذخیرہ کرنے میں مدد دیتے ہیں، جسے خشک موسم میں آبپاشی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پانی کی قلت کا مسئلہ حل ہوتا ہے اور فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ حکومت اس تالاب کی تعمیر کے لیے سبسڈی دیتی ہے۔

4. کسان کریڈٹ کارڈ (KCC) یہ اسکیم کسانوں کو کم شرح سود پر قرض فراہم کرتی ہے۔ KCC کے ذریعے کسان اپنی زرعی ضروریات جیسے بیج، کھاد، اور مشینری خریدنے کے لیے آسانی سے قرض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اسکیم کسانوں کو مہنگے پرائیویٹ قرضوں سے بچاتی ہے۔

5. سولر پمپ یوجنا یہ اسکیم کسانوں کو اپنے کھیتوں میں آبپاشی کے لیے سولر پمپ لگانے کے لیے سبسڈی فراہم کرتی ہے۔ اس سے بجلی کے بل کا خرچ کم ہوتا ہے اور بجلی کی کمی کے دوران بھی آبپاشی جاری رہتی ہے۔ یہ اسکیم زراعت میں شمسی توانائی کے استعمال کو فروغ دیتی ہے۔ یہ اسکیمیں کسانوں کی اقتصادی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے اور زراعت کے شعبے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ مزید تفصیلات یا کسی خاص اسکیم کے بارے میں جاننے کے لیے، آپ اتر پردیش کے محکمہ زراعت کی آفیشل ویب سائٹ دیکھ سکتے ہیں۔

❑❑❑

وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ اہم وزراء کے ساتھ محکمہ خواتین بہبود کی جانب سے لگی نمائش کا معائنہ کرتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ منعقدہ تقریب میں شرکاء کو خطاب کرتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 3
अक्टूबर, 2024
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**